ٹیکنالوجی
اور
وسائل کی آزادی

طارق بٹ

ٹیکنالوجی
اور
وسائل کی آزادی

طارق بٹ

کلاسیک 42- دی مال، لاہور

ناشر: آغا امیر حسین

ناشران
کلاسیک
چوک ریگل۔ ۴۲ دی مال لاہور۔ ۵۴

فون:7312977
فیکس:7323963
agha@classicpublishers.com
www.classicpublishers.com

جملہ حقوق محفوظ

بارِاوّل	ستمبر 2006ء
کمپیوٹرورک	آصف علی بیگ
قیمت	175 روپے

طابع سید ندیم حسین آغا
سپوتنک پرنٹرز
13-C فین روڈ لاہور

والدین کے نام.....

فہرست

مسلم ممالک کیوں ترقی یافتہ ممالک نہ بن سکے؟	11
انسانی وسائل، تیل، قدرتی گیس اور عالمی طاقتیں	19
منشیات اور عالمی طاقتیں	25
ملٹی نیشنل کمپنیاں، میڈیسن اور پاکستان	31
پاکستان زراعت میں کیوں خود کفیل نہ ہو سکا؟	37
انفارمیشن ٹیکنالوجی کا معاشی ترقی میں کردار	41
کرپشن کریسی	45
این جی اوز سرمایہ کاری	49
آبادی کا معاشی ترقی میں کردار	53
ٹیکس کا معیشت میں کردار	59
پاکستان میں انڈسٹریل کلچر کیوں پیدا نہ ہو سکا؟	63
سمگلنگ ایک معاشی ناسور	71
کاٹیج انڈسٹری کا معاشی ترقی میں کردار	75
بے روزگاری	79
وفاقی بجٹ 2000-1999ء (جائزہ)	83

معیشت اور ثقافت	89
افراطِ زر مہنگائی اور کرنسی ڈی ویلیوایشن	93
بینک اور بینک فراڈ	99
ترقی پذیر ممالک اور بین الاقوامی تجارتی خسارہ	105
ایڈ سے ایڈز تک	109
انسانی وسائل کی منتقلی	115
دولت کی غیر مساوی تقسیم	119
جدید دورِ غلامی	123
سائنس اور معیشت	127
کمپنیوں کی حکومت	133
سپر پاور کی سپر کرنسی	137
غیر پیداواری سرمایہ کاری	143

عرض مصنف

ترقی پذیر ممالک اس لیے ترقی پذیر ہیں کہ ان کے پاس جدید ٹیکنالوجی نہیں ہے، جدید ٹیکنالوجی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے انسانی وسائل اور قدرتی وسائل پر ترقی یافتہ ممالک قابض ہیں۔امن اور برابری طاقت کے توازن کا نام ہے،طاقت ٹیکنالوجی سے حاصل ہوتی ہے،ٹیکنالوجی سے مراد ایسا سائنسی عمل ہے جو پیداوار کو آسان ترین، بہترین ،سستا ترین اور تیز ترین بناتا ہے جیسا کہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے کمپوزنگ، ڈیزائننگ، پرنٹنگ، اکاؤنٹنگ اور کمیونکیشن وغیرہ آسان ترین، سستی ترین،اور تیز ترین ہوگئی ہے۔

ترقی یافتہ ممالک نے عراق کی ایٹمی ٹیکنالوجی تباہ کروادی تا کہ وہ طاقت ور ملک نہ بن جائے ایران کو ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کرنے سے روکا جارہا ہے ماضی میں چین کو باقاعدہ افیم کا عادی بنایا گیا تا کہ وہ مستقل غلام رہے اور سائنسی کلچر چائنہ میں پیدا نہ ہو لیکن ترقی یافتہ ممالک چائنہ کے سلسلہ میں کامیاب نہ ہو سکے جاپان میں قدرتی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن اس کے پاس جدید ٹیکنالوجی ہے، جاپان کا رقبہ 3,77,835 مربع کلومیٹر ہے اور آبادی تقریباً 13 کروڑ ہے ،پاکستان کا رقبہ 8,03,940 مربع کلومیٹر اور آبادی تقریباً 16 کروڑ ہے یعنی جاپان کا رقبہ پاکستان کے رقبہ کے مقابلہ میں 1/2 سے بھی کم ہے۔دنیا کے چند گنجان آباد ممالک میں جاپان کا شمار ہوتا ہے پھر بھی وہ دنیا کا امیر ترین اور ترقی یافتہ ملک ہے کیونکہ اس کے پاس جدید ٹیکنالوجی ہے۔ایشیا میں سب سے پہلے جس نے جدید ٹیکنالوجی حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی وہ جاپان ہے۔

ترقی یافتہ ممالک منصوبہ بندی سے ترقی پذیر ممالک میں ایسے مختلف شعبہ کے دانشوروں کو پروموٹ کرتے ہیں جو مثبت تبدیلی کے لیے عملی جدوجہد کے قائل نہ ہوں بلکہ صبر اور تقدیر کا فلسفہ پیش کریں جاگیردارانہ نظام، آمریت، غیر سائنسی تعلیم اور ناانصافی کے

خلاف چلنے والی کسی تحریک میں حصہ نہ لیں ترقی یافتہ ممالک ایسے مذہبی لوگوں کونوازتے ہیں جو کہ گوشہ نشینی کو اہمیت دیں استحصال کے خلاف آواز نہ بلند کریں، سوشل ورک نہ کرتے ہوں، سپورٹس میں انفرادی گیم کی بجائے اجتماعی گیم کو پروموٹ کرتے ہیں جیسا کہ کرکٹ وغیرہ کیونکہ اس میں گیمبلنگ کا مرکز برطانیہ ہے، برطانیہ ہی کرکٹ کے جواریوں کو کنٹرول کرتا ہے اور کرکٹ کے جواری اپنی رقم ترقی یافتہ ممالک میں جمع کرواتے ہیں۔ترقی یافتہ ممالک پسماندہ ممالک کے گلوکاروں کو ہیرو کے روپ میں پیش کرتے ہیں کیونکہ بازارِ حسن ہیکس اور پاپ میوزک کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے ترقی یافتہ ممالک کرپٹ شخصیات کو ترقی پذیر ممالک میں رقم خرچ کر کے اور سیاست کر کے حکمران بناتے ہیں تا کہ وہ مستقبل میں ان کے لیے رکاوٹ نہ بن سکے۔ترقی یافتہ ممالک خالص سائنسی تعلیم کو ترقی پذیر ممالک میں عام نہیں ہونے دیتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ذہین دماغ ہی وسائل پیدا کرتا ہے (Brain Generate Resources) سائنس دان ہی کسی ملک کی تقدیر سنوار سکتا ہے وہ کسی بھی ترقی پذیر ملک میں خالص سائنسدان کو ہیرو کے روپ میں پیش نہیں کرنے دیتے تا کہ طالب علم اور قوم میں سائنس کلچر پیدا نہ ہو۔

اس کتاب میں 27 مضامین ہیں 23 مضامین روزنامہ نوائے وقت میں چھپے ہیں اور 4 مضامین مختلف جرائد میں پرنٹ ہوئے ہیں ان مضامین کو اَپ ڈیٹ کیا گیا ہے، ان میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ کیسے امریکہ اور اُس کے دوست ممالک ترقی پذیر ممالک جیسا کہ پاکستان وغیرہ کا استحصال کررہے ہیں اور کیسے ترقی پذیر ممالک /پاکستان خوشحال ہوسکتے ہیں۔ برین /ٹیلنٹ ترقی پذیر ممالک، اسلامی ممالک میں پیدا ہوتا ہے معاشی فوائد عالمی طاقتیں حاصل کرتی ہیں، منشیات کے خاتمہ کا پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے لیکن اس کے برعکس منشیات کی تجارت پر کنٹرول امریکہ اور برطانیہ کا ہے، میڈیسن کی کمپنیاں مختلف ترقی پذیر ممالک میں مختلف برانڈ سے مختلف میڈیسن فروخت کر کے ڈھیروں منافع کماتی ہیں مگر میڈیسن کی کوالٹی وہ نہیں ہوتی جو کہ ملٹی نیشنل کمپنیاں ترقی یافتہ ممالک کو میڈیسن فراہم کرتی

ہیں، ترقی پذیر ممالک کو ترقی یافتہ ممالک صنعتی ممالک بننے نہیں دیتے ہیں بلکہ زراعت میں بھی مکمل خود کفیل نہیں ہونے دیتے، ترقی پذیر ممالک میں کمپیوٹر ڈرائیور/ ٹائپسٹ پیدا ہورہے ہیں، کمپیوٹر مینوفیکچرنگ نہیں ہورہی ہے، ترقی پذیر ممالک کے کرپٹ سرمایہ داروں/ حکمرانوں کی رقم ترقی یافتہ ممالک کے بینکوں میں جمع ہے لیکن انٹرنیشنل جرائد کی لسٹ میں کرپشن کے سلسلہ میں صرف ترقی پذیر ممالک کا نام آتا ہے، این جی اوز عالمی طاقتوں کے ایجنٹ کا کردار ادا کررہی ہیں۔ آبادی کو چائنہ اور جاپان کی طرح منصوبہ بندی سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہر انسان ایک پیٹ/ایک دماغ مگر دو ہاتھ لے کے پیدا ہوتا ہے، اندورنِ ملک اشیاء پر ٹیکس کم اَز کم ہونا چاہئے اور کسٹم ڈیوٹی زیادہ سے زیادہ ہونی چاہئے خاص طور پر تعیشاتی اشیاء جیسا کہ لگژری کاریں وغیرہ۔ برین ڈرین کو روکنا ہوگا دولت کی مساوی تقسیم کرنی ہوگی سائنسی تعلیم کو فروغ دینا بہت ضروری ہے، غیر پیداواری اخراجات ختم کرنا ہوں گے، تجارت میں سپر کرنسی کی بجائے گولڈ کرنسی کو فروغ دینا ہوگا، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مقابلہ میں نیشنل کمپنیوں کو لانا ہوگا۔ ایڈ ترقی پذیر ممالک میں ایڈز کی صورت اختیار کرگئی ہے اپنی مدد آپ کرنی ہوگی، غیر پیداواری اخراجات کم کرنا ہوں گے، عوام کو اعتماد میں لینا ہوگا تاکہ وہ پاکستانی بینکوں میں رقم جمع کروائیں بینکوں میں بینک فراڈ کو روکنا ہوگا، مہنگائی میں بنیادی کردار کرنسی ڈی ویلیوایشن کا ہے گولڈ کرنسی کو فروغ دینا ہوگا، مثبت ثقافت کو فروغ، بیروزگاری کا خاتمہ، کاٹیج انڈسٹری کو فروغ، سمگلنگ کا خاتمہ اور پاکستان، ترقی پذیر ممالک میں انڈسٹریل کلچر پیدا کرنا ہوگا۔

کتاب زیادہ خشک نہ ہوجائے اس لیے بہت ضروری اعداد و شمار کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ مضامین میں سادہ اور عام فہم الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اصطلاحات کو آسان بنایا گیا ہے۔ پروفیسر طارق جاوید اور طارق اسماعیل ساگر کا شکرگزار ہوں جنھوں نے مضامین کے سلسلہ میں مختلف اوقات میں مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور میری حوصلہ افزائی کی۔

طارق بٹ

مسلم ممالک کیوں ترقی یافتہ ممالک نہ بن سکے؟

اسلام سے قبل عرب چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں تقسیم تھے، یہ قبائل آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ اسلام نے عربوں کو نئی جہت دی ان میں خود اعتمادی اور جوش پیدا کیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے آپ پر بہت اعتماد تھا، یہی ایمان اور خود اعتمادی انھوں نے اپنی قوم کو دی۔ ریگستان کے ان لوگوں نے جن کی اسلام سے پہلے کوئی حیثیت نہیں تھی اس وقت کی تقریباً آدھی دنیا پر اپنا پرچم لہرا دیا۔ اسلام نے اخوت کا درس دیا یعنی مسلمانوں کو کہا کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں، ذات برادری اور قبائل کو ختم کیا اس طرح ایک حد تک جمہوریت لاگو کی، وفاتِ مسیح کے چھ سو برس بعد عرب نے یروشلم پر قبضہ کیا۔ 1095ء میں صلیبی جنگوں کی ابتداء ہوئی اور کوئی ڈیڑھ سو برس تک عیسائیت اور اسلام کی، صلیب اور ہلال کے درمیان کشمکش جاری رہی۔ ان صلیبی جنگوں کو کروانے میں اہم کردار پطرس راہب کا تھا اس نے پاپائے روم اور مجلس کلیسا کو متاثر کیا کہ بیت المقدس پر حق صرف عیسائی مذہب کا ہے۔ ماہرین معاشیات کے مطابق ان صلیبی جنگوں کی اہم وجہ خالص تجارتی راستے تھے، تمام کاروباری طبقہ بالخصوص وینس اور جنیوا کی بندرگاہوں کے تاجر اس حق میں تھے کیونکہ سلجوقی ترکوں نے ان کے مشرق کی طرف کے تجارتی راستے بند کر دیئے تھے جس کی وجہ سے ان کی تجارت کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا، عیسائیوں کی صلیبی جنگیں زیادہ تر سلجوقی مسلمانوں سے ہوئی ہیں۔ صلاح الدین ایوبیؒ سلطانِ مصر نے صلیبی جنگوں میں بڑی شہرت حاصل کی کیونکہ اس نے ستر برس بعد عیسائیوں سے بیت المقدس چھین لیا تھا، صلاح الدین ایوبیؒ نے صلیبی جنگ کے دوران بھی بہت سے کالج اور ہسپتال کھولے، تقریباً بارہ سو برس تک مسلمانوں کا بیت المقدس پر قبضہ رہا حتیٰ کہ 1918ء میں پہلی جنگِ عظیم کے آخر میں ایک انگریز جرنیل نے ترکوں سے اسے چھین لیا۔ صلیبی جنگیں بے شک مسلمانوں نے جیت

لیں لیکن وہ اپنے اندر اتحاد قائم نہ رکھ سکے، تعلیم سے دوری اور جاگیردارانہ نظام نے ان کی سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں اور ان کو تقسیم کر دیا، پچھلے تین سو سالوں سے مسلمان زوال کا شکار ہیں۔ مسلمان کیوں ترقی یافتہ ممالک نہ بن سکے اس کی مندرجہ ذیل اہم وجوہات ہیں:

سلطنتِ عثمانیہ اور مغرب کی جب کشمکش جاری تھی تو مغرب نے اندازہ لگایا کہ سلطنت عثمانیہ کو ختم کرنا اُس وقت تک ممکن نہیں کہ جب تک مسلمانوں میں پھوٹ نہ ڈال دی جائے، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور سلطنتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کے لیے ٹی ایم لارنس کو تیار کیا گیا جس نے خاص طور پر صلیبی جنگوں پر تحقیق کی اُس نے بیسویں صدی کے شروع میں عربوں کو متحد کیا اور سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف لڑوا دیا، اس نے عربوں میں عرب اِزم جگایا، جب عرب سلطنتِ عثمانیہ سے علیحدہ ہو گئے تو پھر انھیں دوبارہ تقسیم کر دیا اور ان کی آپس میں جنگیں کروا دیں، اس طرح مغرب نے کمزور عرب ریاستوں کی بنیاد رکھی، عربوں اور مسلمانوں کو مزید کمزور کرنے کے لیے اسرائیل ریاست کو قائم کیا گیا، بعد ازاں مغرب نے مسلمانوں کو روس کے خلاف استعمال کیا جسے افغان روس جنگ کا نام دیا، اس جنگ میں روس کو شکست دے دی تو پھر افغان مسلمانوں کو تقسیم کیا اور آپس میں لڑوا دیا اور خود مغرب والوں نے افغانستان پر قبضہ کر لیا، مسلمانوں کو استعمال کرنا مغرب والوں کا آزمودہ ہنر ہے جتنی دیر تک مسلمان متحد نہیں ہوں گے اُتنی دیر تک ان کا استعمال ہوتا رہے گا۔

بیشتر اسلامی ممالک میں آمریت ہے، کہیں فوجی آمریت ہے اور کہیں شاہی خاندانوں کی آمریت ہے، زیادہ تر آمر مغربی ممالک میں اپنی رقم جمع کرواتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کی حمایت سے ہی وہ حکمران رہ سکتے ہیں، جمہوریت نہ ہونے کی وجہ سے فکری آزادی نہ ہونے کے برابر ہے، آمروں کی کوشش ہوتی ہے کی تعلیم اور سچائی عام نہ ہو کیونکہ اس سے آمریت کو خطرہ ہے، عراق اور مغربی اتحادی ممالک کی جنگ پر زیادہ تر جلوس مغرب میں ہی نکالے گئے کیونکہ مغرب میں جمہوریت ہے جبکہ اسلامی ممالک کے زیادہ تر سیاستدان آمروں کے ہی ایجنٹ ہیں اس لیے جعلی سیاستدانوں نے عراق کی حمایت میں کوئی بڑا جلوس نہیں نکالا، ظاہری طور پر مغرب کا دعویٰ ہے کہ وہ جمہوریت کی حمایت

کرتے ہیں لیکن اصل حقیقت اس کے برعکس ہے 2004ء میں انھوں نے آئی ایم ایف کے ملازم من موہن سنگھ کو ہندوستان کا وزیراعظم بنوادیا جو کہ ہندوستان کا پہلا غیر سیاسی وزیراعظم ہے۔

اسلامی ممالک میں عورت کا کردار بہت محدود ہے زیادہ تر وہ ہاؤس وائف کا کردار ادا کرتی ہے جبکہ مغرب میں وہ مرد کے شانہ بشانہ کام کررہی ہیں۔ اسلامی ممالک کو چاہئے کہ وہ عورتوں کو تعلیم دیں اور عورتوں کو خاص طور پر دو شعبوں یعنی تعلیم اور صحت میں کام دیں، استاد کا شعبہ ایک مقدس شعبہ ہے عورت بچوں اور بچیوں کو اچھے طریقے سے تعلیم دے سکتی ہے اس طرح عورتیں بھی برسرِ روزگار ہو جائیں گے اور ملکی ترقی میں اہم کردار ادا کریں گی، ڈاکٹر کے شعبے سے اچھا شعبہ دنیا میں کوئی نہیں ہے، اچھی لیڈی ڈاکٹر بچوں اور بچیوں کا اچھے طریقے سے علاج کرسکتی ہے، عورتوں کے مسائل عورتوں کو سنائے جاسکتے ہیں، عورتیں ہر ملک میں تقریباً پچاس فیصد کے قریب ہیں، اسلامی ممالک عورتوں کو تعلیم دیں اور محکمہ تعلیم اور محکمہ صحت میں ترجیحی بنیادوں پر نوکریاں دیں تاکہ وہ معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرسکیں۔

معلومات کا ایسا مجموعہ جو مطالعہ، مشاہدہ اور غیر جانبدارانہ تجربہ کے بعد حاصل ہوتا ہے اسے علم کہتے ہیں، علم کی دو اقسام ہیں یعنی علمِ الدایت اور علمِ الحقیقت اس علم کو جب استاد سے شاگرد حاصل کرتا ہے تو اسے تعلیم کہتے ہیں، تعلیم ہی انسان کے اندر سپرٹ آف انکوائری پیدا کرتی ہے، تجسس اور سیکھنے کی لگن سے ہی معاشرے میں ذہنی، سیاسی، سماجی اور علمی انقلابات آتے ہیں، انسانی دماغ وسائل پیدا کرتا ہے۔ موجودہ دور کی سب سے بڑی ایجاد ''کمپیوٹر'' انسانی دماغ ہی کی پیداوار ہے، جاپان جس کے پاس قدرتی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں نے بھی معاشی ترقی سائنسی علوم ہی کی بنیاد پر کی ہے انسان اس دنیا میں بے لباس آیا اس نے سائنس ایجوکیشن کی مدد سے اپنی حفاظت کے لیے روٹی، کپڑا، مکان، میڈیسن، ہوائی جہاز، آرمز اینڈ ایمونیشن اور کمپیوٹر وغرہ وغیرہ بنایا، انسان اور جانور کے درمیان بنیادی فرق علم کا ہی ہے وگرنہ بہت سے جانور انسان سے زیادہ طاقتور ہیں۔ انسان عقل اور آرمز اینڈ ایمونیشن کی ہی وجہ سے جانوروں اور درندوں کو کنٹرول کرتا ہے، علم

حاصل کرنے کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں یعنی ماڈرن نصابِ تعلیم، استاد اور شاگرد، اسلامی ممالک میں ابھی تک فرسودہ نظامِ تعلیم رائج ہے، نصابِ تعلیم کے لیے ایشیاء میں ہمارے پاس چین، تائیوان جنوبی کوریا، جاپان اور ملائیشیا ہے، ہمیں ان مندرجہ بالا ملکوں کے نصابِ تعلیم سے مستفید ہونا چاہئے، موجودہ دور کے اعلیٰ علوم میں نیوکلیئر فزکس، میڈیسن، میٹلر جی اور کمپیوٹر مینو فیکچرنگ وغیرہ کے علوم ہیں ان مندرجہ بالا مضامین میں ڈاکٹریٹ کرنے والے سب سے زیادہ طالب علم امریکہ کے پاس ہیں اس کے بعد دوسرے نمبر پر ڈاکٹریٹ کرنے والے چائینہ کے طالب علم ہیں جب کہ اسلامی ممالک میں زیادہ تر ڈاکٹریٹ طالب علم آرٹس کے علوم میں کر رہے ہیں، ضرورت ہے ہر اسلامی ملک میں زیادہ سے زیادہ تحقیقاتی ادارے، سائنس لیبارٹریز اور سائنس ایجوکیشن کے ادارے بنائے جائیں۔ ترقی پذیر ممالک اور ترقی یافتہ ممالک میں بنیادی فرق سائنس ایجوکیشن کا ہی ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہی معاشی ترقی کا راز مضمر ہے۔

اس وقت دنیا کی کل آبادی تقریباً 6 ارب انسانوں پر مشتمل ہے، مسلمانوں کی آبادی ایک ارب پچیس کروڑ ہے دنیا کا کل رقبہ 134 ملین مربع کلومیٹر ہے جبکہ 56 اسلامی ممالک کا رقبہ 30 ملین مربع کلومیٹر ہے اس طرح اسلامی ممالک کا رقبہ تقریباً 23 فیصد بنتا ہے، آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے مسلمانوں کو بہت زیادہ اہمیت ہے جبکہ مسلمان آبادی اور رقبہ کا صحیح استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ یورپ نے اپنی آبادی کا مناسب استعمال کیا، برِاعظم آسٹریلیا اور برِاعظم امریکہ پر قبضہ کیا، اسی عمل سے انھوں نے اپنے وسائل اور طاقت میں اضافہ کیا اس کے برعکس مغربی ممالک نے مسلمانوں کو جنگوں میں الجھائے رکھا، جیسا کہ عرب اسرائیل جنگ، ایران عراق جنگ، عراق کویت جنگ، افغانستان روس جنگ وغیرہ، ان جنگوں میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے اور کروڑوں ڈالر ضائع ہوئے اب بھی مسئلہ کشمیر، مسئلہ چیچنیا، مسئلہ فلسطین، مسئلہ بوسنیا وغیرہ پر مسلمانوں کے انسانی وسائل اور قدرتی وسائل ضائع ہو رہے ہیں، مندرجہ بالا مسائل سبھی مسلمانوں کو یورپ نے ہی دیئے ہیں، ضرورت ہے کہ جامع لائحہ عمل تیار کیا جائے تا کہ انسانی وسائل اور قدرتی

وسائل کا مثبت استعمال کیا جائے۔

تیل اور گیس کے وسیع ذخائر اس وقت اسلامی ممالک کے پاس ہیں جس پر عالمی طاقتوں کی نظر ہے سب سے پہلے ایران نے تیل کی آزادی کے لیے وزیراعظم ایران ڈاکٹر تصدق حسین کی قیادت میں آواز بلند کی، ڈاکٹر تصدق حسین کو امریکہ اور برطانیہ کی سازش سے شاہِ ایران نے حکومت سے محروم کر دیا۔ 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ میں امریکہ اور برطانیہ نے اسرائیل کا ساتھ دیا جس کے نتیجہ میں اسلامی ممالک متحد ہو گئے اور تیل کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا، اسلامی ممالک جن کے پاس اس وقت 49 فیصد تیل ہے کے خلاف مغرب نے تیل اور قدرتی وسائل پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا جسے امریکہ نے نیو ورلڈ آرڈر کا نام دیا ہے، عراق کویت جنگ اسی منصوبہ کا حصہ تھی، اس جنگ کا فائدہ اٹھا کر امریکہ نے سارے عرب ممالک میں اپنی فوجیں اُتار دیں، افغان امریکہ اتحادی جنگ، عراق امریکہ اتحادی جنگ ابھی جاری ہیں، ان دونوں گوریلا جنگوں کے ختم ہونے کے امکانات ابھی نظر نہیں آ رہے ہیں، مستقبل میں ایران اور امریکہ اتحادی ممالک کے درمیان جنگ ہونے کا چانس ہے۔

مغربی ممالک میں افراطِ زر کافی حد تک کنٹرول میں ہے اس کے برعکس اسلامی ممالک میں افراطِ زر اور مہنگائی کافی زیادہ ہے اس کی بنیادی تین وجوہات ہیں، پہلی وجہ ون یونٹ کرنسی ویلیو (One Unit Currency Value) کم ہونا ہے۔ امریکی ڈالر اس وقت 60 روپے کے قریب ہے جبکہ آئی ایم ایف سے پہلے ون یونٹ کرنسی ویلیو دنیا میں تقریباً برابر تھی، امریکہ میں جو شخص 2000 روپے تنخواہ وصول کرتا ہے، پاکستان میں اسے 120000 روپے ملتے ہیں، یہی کشش برین ڈرین میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ اسلامی ممالک میں کرنسی کو ایک بزنس کی حیثیت حاصل ہے، فارن کرنسی ایک قسم کی امپورٹڈ آئٹم بن گئی ہے، سرمایہ دار اپنی رقم فیکٹری بنانے کی بجائے کرنسی بزنس میں لگا رہے ہیں جو ایک غیر پیداواری عمل ہے، اس کرنسی بزنس کو روکنا چاہئے، مغرب میں کرنسی کو ایک بزنس کے طور پر نہیں لیا جاتا، وہاں رقم پیداواری کاموں میں خرچ کی جاتی ہے، مہنگائی کی

دوسری اہم وجہ ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں وہ اپنی مرضی سے اشیاء کی قیمت مقرر کرتی ہیں کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں قیمتوں کا نظام طلب ورسد کے ماتحت ہے۔ 200 کے قریب ملٹی نیشنل کمپنیاں اسلامی معیشت پر چھائی ہوئی ہیں، ضرورت ہے کہ اسلامی ملٹی نیشنل کمپنیاں بنائی جائیں، مہنگائی کی تیسری بڑی وجہ امپورٹڈ اشیاء ہیں، مغرب جدید اشیاء کے نام پر اسلامی ممالک کو انتہائی مہنگی اشیاء فروخت کر رہا ہے، ضرورت ہے کہ مقامی اشیاء کو اہمیت دی جائے اور امپورٹڈ اشیاء کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

زیادہ تر اسلامی ممالک مغرب کی کالونی رہے ہیں، ان ممالک میں انڈسٹریل کلچر کو فروغ نہیں پانے دیا گیا، سائنس ایجوکیشن ہی انڈسٹری کی بنیاد ہے، سائنسدان نظریہ پیش کرتا ہے، استاد اس نظریے کو شاگرد تک پہنچاتا ہے، صنعت کاران شاگردوں یعنی انجینئروں سے کام لے کر مصنوعات تیار کرتا ہے اس طرح سائنس تھیوری عملی شکل میں مارکیٹ میں آجاتی ہے، آج سے 10 سال پہلے جو کمپیوٹر ویلیو تھی آج اس ویلیو کا 25 فیصد بھی صنعت کار مارکیٹ سے وصول نہیں کر رہا ہے کیونکہ کمپیوٹر مینوفیکچرنگ کی تھیوری چائینہ پہنچ چکی ہے اور کمپیوٹر کی خرید وفروخت میں کافی مقابلہ آچکا ہے، یعنی دولت حاصل کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ سائنسدان کا ہے ابھی تک انڈسٹریل کلچر اسلامی ممالک میں پیدا نہ ہونے کی اہم وجہ سائنس ایجوکیشن سے دوری ہے، چائینہ اور جاپان کی ترقی کرنے کی دوسری اہم وجہ مشین میکنگ انڈسٹری ہے کوئی بھی چیز تیار ہوتی ہے وہ مشین پر ہوتی ہے، جب بھی مغرب نے کوئی شے ایجاد کی چائینہ اور جاپان نے اس مشین کا ماڈل کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیا اور دو سال کے اندر اندر وہ شے خود تیار کر لی۔ پاکستان میں مشین میکنگ انڈسٹری کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے کیونکہ ابھی تک مشین میکنگ انڈسٹری کو کسٹم ربیٹ نہیں مل رہا ہے، مشین میکنگ انڈسٹری کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دینے کی ضرورت ہے، انڈسٹریل کلچر پیدا کرنے میں جاگیرادارنہ نظام، برین ڈرین، ملٹی نیشنل کمپنیاں، پیچیدہ ٹیکس سسٹم، مہنگی یوٹیلیٹی سروسز رکاوٹ ہیں، مندرجہ بالا رکاوٹیں دور ہونی چاہئیں اور مندرجہ بالا رکاوٹیں دور ہو جائیں تو اسلامی ممالک زراعت میں بھی خود کفیل ہو جائیں گے۔

دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد امریکہ نے ترقی پذیر ممالک کی معیشت، سیاست اور خارجہ پالیسی پر کنٹرول کرنے کا پروگرام بنایا، اس پروگرام کے تحت امریکہ نے جنگ کیے بغیر اسلامی ممالک کے وسائل پر قبضہ کرلیا، اس منصوبے کا خالق امریکی جنرل سیاستدان اور وزیر خارجہ جارج مارشل تھا، اس منصوبہ کو مارشل پلان کا نام دیا گیا، اسی مارشل کو بعد ازاں نوبل انعام دیا گیا، مارشل کے اس منصوبے کو بیرونی امداد کا نام دیا گیا اس امداد کی کچھ شرائط بھی ہیں مثلاً قیمتوں میں چھوٹ کا خاتمہ، یوٹیلیٹی سروسز کا مہنگا کرنا، درآمدات پر کسٹم ڈیوٹی میں کی، قیمتوں پر کنٹرول کا خاتمہ، روپے کی قدر و قیمت میں کمی، ٹریڈ یونین پر کنٹرول، اہم ڈیپارٹمنٹس کے ہیڈ آفیسز میں مغربی نمائندوں کا تعین، ملٹی نیشنل کمپنیوں کو سہولت دینا، اشیاء کی خریداری بیرونِ ملک سے کرنا اور فارن کرنسی میں تجارت وغیرہ وغیرہ، ان شرائط کی وجہ سے اسلامی ممالک کو جو ایڈ ملی وہ ایڈز کی صورت اختیار کرگئی۔ مارشل پلان اسلامی ممالک کے لیے مارشل لاء پلان ثابت ہوا، اسلامی ممالک کی اکثریت میں آمریت نافذ ہوئی، ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنی زائد پیداوار بیچنے کے لیے اسلامی ممالک پہنچ گئیں، اس طرح انھوں نے معیشت، سیاست اور خارجہ پالیسی کو متاثر کیا، انسانی اور قدرتی وسائل کو استعمال کیا۔ بیرونی امداد سے بچنا ہی بہادری ہے کیونکہ خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔

مس پلاننگ نے اسلامی ممالک کو بہت نقصان پہنچایا، اسلامی ممالک نے جدید سکول، کالج، یونیورسٹیاں، فیکٹریاں اور ہسپتال بنانے کی بجائے بڑی بڑی عمارتیں، ائیر پورٹ، سی پورٹ، سپورٹس سنٹر قائم کیے ہیں، اسلامی ممالک کے حکمرانوں کی ترجیحات سمجھ سے بالاتر ہیں، پاکستان میں بھی مختلف منصوبوں پر رقم ضائع کی گئی، یعنی تعلیمِ بالغاں اور نئی روشنی سکول وغیرہ وغیرہ۔ چائینہ میں 6 ہزار کے قریب ڈیم ہیں اور ایران میں 2 ہزار سے زیادہ ڈیم ہیں جبکہ پاکستان میں ابھی تک تقریباً 50 سال سے کالا باغ ڈیم کا فیصلہ نہیں ہوسکا، ضرورت ہے کہ ہر ڈویژن کا اپنا ڈیم بنایا جائے تاکہ بجلی سستی ہو، انڈسٹری کو سہولت ملے، روزگار ملے اور ملک معاشی ترقی کرے۔

اسلامی ممالک کے پاس رول ماڈل کے لیے یورپی یونین ہے جسے یورولینڈ اور یورو یونین بھی کہتے ہیں، مسلم دانشوار اسے کرسچن کلب کا نام دیتے ہیں جس کی سب سے بڑی مثال ترکی کو یورپ میں شامل نہ کرنا ہے، یورپی یونین کی جو خوبیاں سامنے آئی ہیں ان میں مشترکہ خارجہ پالیسی، مشترکہ کرنسی، مشترکہ بینکنگ، مشترکہ دفاعی پالیسی، امپورٹ ایکسپورٹ پالیسی اور ویزہ سسٹم وغیرہ ہیں، اسلامی ممالک اگر یورپی یونین کی پالیسی کو فالو کرلیں تو یہ سامرجی طاقتوں سے بچ سکتے ہیں وگرنہ ان کا مستقبل تاریک ہے کیونکہ بے شمار کمزور ممالک طاقتور ممالک نے دنیا کے نقشے سے ختم کردیئے، طاقتور یہ صرف اتحاد اور سائنس کلچر کی صورت میں ہی ہوسکتے ہیں کیونکہ زیادہ تر عرب ممالک کی حیثیت آئل کمپنیوں سے زیادہ نہیں ہے۔

انسانی وسائل، تیل، قدرتی گیس اور عالمی طاقتیں

قدرت نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے، مذہب، نسل اور ریاست کا نام استعمال کر کے طاقتور انسانوں نے کمزور انسانوں کو غلام بنایا، ان کی خدمات کو اپنے مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ مصر کے فرعون بادشاہوں نے اپنے لیے اہرام بنوائے، بنی اسرائیل کو غلام بنایا جسے بعد ازاں حضرت موسیٰ علیہ اسلام نے آزاد کروایا۔ قدیم تہذیبوں یعنی یونان، مصر، عراق، ہندوستان اور ایران وغیرہ میں بھی غلام رکھنے کا رواج تھا، ہندوستان میں تو اسے ایک ادارہ کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں ذات پات کی بنیاد پر غلامی تھی، شودر نسل در نسل غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، یورپی اقوام برِاعظم افریقہ کے انسانوں کو امریکہ میں غلام کی حیثیت سے لائے اور ان کو کاشت کاری میں استعمال کیا، امریکہ سے تمباکو، کاٹن اور لیدر یورپ لے کر گئے، یورپ کے حکمرانوں نے پہلی جنگِ عظیم اور دوسری جنگ عظیم میں ہندوستانی عوام کو جنگوں میں استعمال کیا اور اپنے مقاصد حاصل کیے، اپنے اسلحہ کی فروخت اور سپر میسی کو برقرار رکھنے کے لیے عالمی طاقتوں نے ایران عرب کشمکش پیدا کی، اسرائیل عرب جنگ، ایران عراق جنگ، عراق کویت جنگ، افغانستان، پاکستان اور اسلامی ممالک کی اشیاء و خدمات کو سویت یونین کے خلاف استعمال کیا ان مندرجہ بالا جنگوں میں کروڑوں انسانوں کا قتلِ عام ہوا۔ کمزور اور بھولے بھالے انسانوں کو استعمال کرنے کا سلسلہ بہت پرانا ہے، عالمی طاقتیں جب چاہیں غریب ممالک کے عوام کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں غرض عالمی طاقتیں، ملٹی نیشنل کمپنیاں اور طاقتور افراد جب سے ریاست وجود میں آئی ہے انسانوں کی خدمات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں دنیا میں غلامی ختم ہو چکی ہے لیکن ابھی تک جدید طریقوں سے سپر پاور زانسانوں کو استعمال کر رہی ہیں۔

انسانی وسائل کے ساتھ ساتھ عالمی طاقتیں ترقی پذیر ممالک کے قدرتی وسائل کو بھی

اپنے مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ ترقی پذیر ممالک سے ترقی یافتہ ممالک کو قدرتی وسائل منتقل ہو رہے ہیں اور یہی ترقی یافتہ ممالک کی خوشحالی کا راز ہے۔ دہشت گردی ختم کرنے اور امن قائم کرنے کے نام پر ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر ممالک کے قدرتی وسائل یعنی تیل اور قدرتی گیس پر قبضہ کر رہے ہیں، گیس سے مراد ایسی مادی چیز ہے جو ہلکی اور ہوا کی مانند ہو مثلاً بھاپ، ہوا، آکسیجن، نائٹروجن، ہائیڈروجن، امونیا اور ہائیڈروکلورک ایسڈ گیس وغیرہ، گیسوں کی کچھ مخصوص خاصیتیں ہوتی ہیں۔ قدرتی گیس عموماً پیٹرول کے ذخائر کے ساتھ پائی جاتی ہیں، قدرتی گیس ایک سستا ترین ایندھن ہے اس کے جلنے سے ہوا کثیف نہیں ہوتی، پاکستان میں سوئی (بلوچستان) کے مقام پر 1952ء میں قدرتی گیس دریافت ہوئی۔ تیل کی تین بڑی قسمیں ہیں مہک اور خوشبو دینے والا تیل جو مصنوعی طریقے سے تیار کیا جاتا ہے، معدنی تیل جو پیٹرول اور مٹی کے تیل کی صورت میں چشموں سے نکلتا ہے، تیسرا وہ تیل جو جانوروں کی چربی یا پودوں کے بیجوں وغیرہ سے نکالا جاتا ہے۔ معدنی تیل ایک سیال تیل ہے جو موجودہ زمانے میں توانائی کا بہت بڑا ذریعہ ہے، اس میں ہائیڈروجن کی متعدد مرکبات شامل ہوتے ہیں اور صدیوں زیرزمین دبے ہوئے نباتات وحیوانات کے گلنے سڑنے کے عمل سے بنتا ہے، تیل نکالنے کے لیے زمین میں مشینی برموں سے سوراخ کیے جاتے ہیں پھر اسے پمپوں سے باہر نکال کر پائپ لائنوں کے ذریعے تیل صاف کرنے والے کارخانوں میں پہنچایا جاتا ہے جہاں اُسے صاف کر کے پیٹرول، مٹی کا تیل اور ڈیزل حاصل کیا جاتا ہے، پیٹرول تیل کی سب سے مصفا شکل ہے، ڈیزل، کروڈ آئل اور موبل آئل وغیرہ تیل کی مختلف اشکال ہیں تیل ہزاروں برس سے کسی نہ کسی صورت میں انسانوں کے زیر استعمال رہا ہے دنیا کی قدیم تہذیبیں بابل، مصر، ایران اور روم وغیرہ اس کے استعمال سے واقف تھیں مگر اس دور میں تیل صاف کرنے کا انتظام نہ تھا۔ بین الاقوامی پٹرولیم انسائیکلوپیڈیا (اشاعت 1999ء) کے مطابق تیل کی یومیہ عالمی پیداوار 65.5 ملین (6 کروڑ 55 لاکھ) بیرل تھی جس میں سے 49 فیصد حصہ (تقریباً 3 کروڑ 21 لاکھ بیرل) مسلم ممالک کا تھا اس طرح مسلم ممالک سے تیل کی مجموعی سالانہ

پیداوار تقریباً 11 ارب 72 کروڑ بیرل نکلے گی، اس موقع پر یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ ایک ارب 25 کروڑ سے زائد آبادی پر مشتمل مسلم ممالک کی اکثریت صنعتی طور پر پسماندہ اور ترقی پذیر ہے لہٰذا وہاں تیل کی کھپت بھی صنعتی ممالک کے مقابلے میں بہت کم ہے اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ مسلم ممالک سے پیدا ہونے والا 25 فیصد معدنی تیل مقامی طور پر استعمال ہوجاتا ہے تب بھی 75 فیصد معدنی تیل ترقی یافتہ اور صنعتی ممالک کو برآمد ہوتا ہوگا، مسلم ممالک جو تیل کی پیداوار میں پیش پیش ہیں اُن میں سعودی عرب، عراق، کویت، لیبیا، ایران، برونائی اور متحدہ عرب امارات وغیرہ ہیں۔

مسلم ممالک میں سب سے پہلے قدرتی وسائل کی آزادی کے لیے جس شخص نے آواز اٹھائی اس کا نام ڈاکٹر تصدق حسین تھا، تصدق پارلیمنٹ میں بھاری اکثریت کے نتیجہ میں وزیراعظم ایران کے عہدہ پر فائز ہوا تھا، اُس نے ایران کا کام کرنے والی برطانوی ملکیتی تیل کمپنی کو 1953ء میں قومیانے کی تحریک شروع کردی تھی وہ قدرتی وسائل کو برطانیہ سے آزاد کروانا چاہتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ ایران اگر خود تیل نکالنے اور بیچنے میں کامیاب ہوگیا تو ایران ایک ترقی یافتہ ملک بن جائے گا۔ حکومتِ برطانیہ نے تصدق کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے سلسلہ میں شاہ ایران کو اعتماد میں لیا، امریکہ اور برطانیہ کی مشترکہ کاروائی کے نتیجہ میں وزیراعظم تصدق حسین کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا، شاہ ایران کو دوبارہ مکمل اختیارات سونپ دیئے گئے اور جبر وتشدد کے 25 سالہ دور کا آغاز ہوگیا، جبکہ تیل کی صنعت دوبارہ غیر ملکی ملکیت میں دے دی گئی، جس سے برطانیہ اور امریکہ ہر ایک نے 40 فیصد حصہ وصول کیا۔ آئزن ہاور نظریہ کے مطابق امریکہ کے سوا کسی کو برتری کی یا مشرقِ وسطیٰ اور اُس کے تیل کے ذخائر کی طرف دیکھنے کی بھی یا اُس پر اثر انداز ہونے کی قطعی اجازت نہیں دی جائے گی، اگر کسی نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو اُسے اشتراکی یا دہشت گرد قرار دیا جائے گا۔ ذوالفقار علی بھٹو اور شاہ فیصل نے اسلامی ممالک کے قدرتی وسائل (تیل، گیس) کی آزادی کے لیے آواز اٹھائی تو دونوں شخصیتوں کو ہلاک کروادیا گیا۔

سوویت یونین کی افواج جب افغانستان میں داخل ہوئی تو امریکہ، برطانیہ اور ان کے

حلیف یورپی ممالک نے یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ سویت یونین مشرقِ وسطیٰ کے گرم پانی پر قبضہ کرنا چاہتا ہے یعنی وہاں قدرتی وسائل (تیل، گیس) وغیرہ کو اپنے کنٹرول میں لینا چاہتا ہے، علاوہ اَزیں پاکستان میں اپنی مرضی کی حکومت لانا چاہتا ہے۔ افغانستان کی جنگ میں امریکہ اور برطانیہ نے اسلامی ممالک کے حریت پسندوں کو منظم کیا، عسکری تربیت دی اور انھیں اسلحہ دیا، مالی امداد مشرقِ وسطیٰ اور یورپی ممالک سے حاصل کی، آخر میں امریکہ اور طالبان کو فتح حاصل ہوئی، افغانیوں کی دس لاکھ سے زائد شہادتیں ہوئیں، 30 لاکھ کے قریب معذور ہوئے جبکہ 50 لاکھ افراد بے گھر ہوئے لیکن اس جنگ کا معاشی فائدہ صرف امریکہ، برطانیہ اور یورپ کو ہوا انھوں نے سویت یونین سے آزاد ہونے والی نئی ریاستوں کی معیشت پر کسی حد تک کنٹرول حاصل کیا، وہاں ملٹی نیشنل کمپنیاں پہنچ گئی۔ یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں برِصغیر میں بھی پہنچی تھیں اور بعد اَزاں برِصغیر پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا تھا۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہوگئی لیکن انھوں نے امریکہ کی پسندیدہ کمپنی یونوکال کو وسطیٰ ایشیاء سے پائپ لائن کے ذریعے تیل اور گیس نکال کر براستہ افغانستان مختلف ہمسایہ ممالک کو بھیجنے کا ٹھیکہ دینے کی بجائے بریداس کمپنی ارجنٹائن کو دے دیا یہیں سے افغانستان کو دہشت گرد ملک قرار دینے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب امریکہ کا افغانستان پر قبضہ ہونے کے بعد افغانستان میں امریکہ نے اپنی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو تیل، گیس کا ٹھیکہ دے دیا ہے، افغانستان کے اُن علاقوں پر ہی امریکہ کا مکمل کنٹرول ہے جہاں سے وسطیٰ ایشیاء کی ریاستوں سے پائپ لائن کے ذریعے تیل، گیس براستہ افغانستان ہمسایہ ممالک کو فروخت ہونا ہے۔ افغانستان کی تعمیر اور معیشت کی بحالی کے لیے اربوں ڈالر کے اعلانات ہو چکے ہیں لیکن افغانستان میں اب بھی افغانی عوام کو روٹی، کپڑا، میڈیسن اور تعلیمی سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ سویت یونین کا پراپیگنڈہ کر کے کہ وہ تیل اور گیس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے امریکہ نے خود تیل اور گیس پر قبضہ کر لیا ہے اور افغانستان سے پوری دنیا کو منشیات برآمد کر رہا ہے۔

تیل کی سامراجی کمپنیاں کئی طریقے سے تیل پیدا کرنے والے ملکوں کو لوٹتی ہیں مثلاً تیل کی دریافت کے مرحلے پر، تیل کے کھدائی کے آلات مہنگے داموں فروخت کر کے، تیل

کی صفائی کے مرحلے پر سامراجی کمپنیاں اپنی بے انتہا مہنگی مشینری کے فاضل پرزہ جات اور انتہائی اونچی تنخواہ پانے والے انجینئروں کے ذریعے متعلقہ ملک کی لوٹ کھسوٹ کرتی ہیں، تیل کی نقل وحمل جو پائپ لائنوں کے ذریعے ہوتی ہے یہ کمپنیاں بے پناہ منافع کماتی ہیں، سمندر کے راستے نقل وحمل کے وسائل پر ان ہی عالمی طاقتوں کی کمپنیوں کی اجارہ داری قائم ہے، یہ کمپنیاں اپنی مرضی کا کرایہ وصول کرتی ہیں، تیل کی فروخت کے مرحلے پر بھی سامراجی کمپنیاں اپنی اجارہ داری قائم رکھتی ہیں، دنیا کے مختلف ممالک میں ان کمپنیوں نے پیٹرول پمپوں کا جال بچھا رکھا ہے، پاکستان میں ان کی مثال کالٹیکس، شیل اور ٹوٹل وغیرہ کے پیٹرول پمپ ہیں، نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ تیل سے حاصل ہونے والے منافع کا بڑا حصہ تیل پیدا کرنے والے ملکوں کو نہیں جاتا بلکہ عالمی طاقتوں کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو چلا جاتا ہے۔

اکتوبر 1973ء میں چوتھی اور شدید ترین عرب اسرائیل جنگ میں مغربی ممالک نے اسرائیل کا کھلم کھلا ساتھ دیا اور اُسے مکمل پشت پناہی فراہم کی اس 6 روزہ جنگ میں عربوں کو شکست ہوئی تاہم شکست کا بدلہ لینے کے لیے عرب ممالک نے جو اس وقت تک تیل برآمد کرنے والے ممالک میں سرِفہرست آ چکے تھے متفقہ فیصلہ کیا کہ امریکہ اور ہالینڈ کو پیٹرولیم کی فراہمی روک دی جائے جبکہ تیل کی عالمی قیمتوں میں چار گنا اضافہ کر دیا جائے۔ دسمبر 1973ء سے اس فیصلے پر عملدرآمد کا آغاز ہوا جس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے تیل کے عالمی بحران کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے، انسانی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب تیل کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا گیا تب ہی امریکہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ تیل پیدا کرنے والے ممالک پر قبضہ کرے گا اس قبضہ کو نیو ورلڈ آرڈر کا نام دیا گیا۔ امریکہ نے منصوبہ بندی کے تحت افغانستان، عراق، ایران، لیبیا، شام اور یمن وغیرہ کو دہشت گرد ممالک قرار دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ افغانستان اور عراق پر قبضہ ہو چکا ہے، لیبیا کو دہشت زدہ کیا جا چکا ہے، عراق میں امریکہ کو شدید عوامی مزاحمت کا سامنا ہے لیکن نام صدام اور ایران کا لیا جا رہا ہے جبکہ صدام نے ہمیشہ عالمِ اسلام کو نقصان پہنچایا، کبھی عراق ایران جنگ کے دوران، کبھی عراق کویت جنگ کے دوران، امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک نے عراقی

تہذیب وثقافت کو تباہ و برباد کر دیا ہے، وہاں سے قدیم نوادرات اتحادی فوجیں لوٹ کر لے گئی ہیں، یہ نوادرات قدیم بابل، آشوری، سمیری اور فارسی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں، قدیم لائبریری کو جلا دیا گیا ہے، امریکہ اور اُس کے اتحادی ممالک تیل اور قدرتی گیس پر قبضہ کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کر رہے ہیں، امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کو کوئی روکنے والا نہیں کیونکہ وہ جدید آرمز اینڈ ایمونیشن سے مسلح ہیں۔ اسلامی ممالک تب ہی عالمی طاقتوں سے محفوظ ہوں گے اگر وہ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ کریں، جمہوریت کو فروغ دیں، سائنس کو ذریعہ تعلیم بنائیں، آرمز اینڈ ایمونیشن میں خود کفیل ہوں، یورو ممالک جیسا اتحاد قائم کریں وگرنہ اُن کا مستقبل تاریک ہے۔

منشیات اور عالمی طاقتیں

منشیات کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ افیون اور پوست کی دریافت بھی پتھر کے زمانے میں ہوئی لیکن اس کے باقاعدہ ثبوت چار ہزار سال قبل ملتے ہیں۔ قدیم مصری ،ایرانی اور یونانی اسے دوا کے طور پر استعمال کرتے تھے اور آج بھی اس کا طریقۂ کاشت وہی ہے جو آج سے سات سو سال قبل مسیح تھا لیکن اس وقت اسے دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا جبکہ بعد میں اسے نشے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ برِصغیر میں افیون کو لانے والا یونانی فاتح سکندرِاعظم تھا۔ منشیات سے مراد ایسی دوائیں ہیں جن کے استعمال سے سرور، انبساط کی کیفیت محسوس ہو دنیا سے بے نیازی اور خودی کی کیفیت طاری ہو جائے۔ دنیا میں مشہور مرکبات یا مفردات جنھیں بطور نشہ استعمال کیا جاتا ہے ان میں شراب، بھنگ، چرس، افیون، سگریٹ، حقہ، کافی، قہوہ، کوکا اور چائے وغیرہ ہیں۔ افیون کے پودے سے مارفین، کوڈین، تھیابین جیسے مفید اور کارآمد عناصر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ جو زندگی بچانے والی اور درد سے نجات حاصل کرنے والی ادویات کا ایک لازمی جزو ہیں۔ شراب مشروبِ مغرب ہے، اسلامی ممالک کو مغرب شراب برآمد کر کے اربوں ڈالر ماہانہ وصول کرتا ہے، مغرب میں ہونے والے ٹریفک کے نصف کے قریب حادثات کا سبب شراب نوشی ہے اور نصف کے قریب جرائم کی وجہ بھی شراب ہے لیکن مغرب نے افیون اور ہیروئین کے تاجران کے لیے سزا عمر قید یا سزائے موت رکھی ہے اس کے برعکس شراب کے قانونی تاجران کے لیے کوئی سزا نہیں ہے۔

افیون درحقیقت خشخاش کے پودے کے کچے پھل کا منجمد رس ہے۔ خشخاش بذاتِ خود نقصان دہ نہیں ہے۔ 1979ء میں حدود آرڈیننس کے نفاذ سے پہلے پاکستان میں آٹے اور چینی کے ڈپوؤں کی طرح افیون کے بھی ڈپو تھے۔ افیون سے ہی ہیروئین تیار کی جاتی

ہے۔ ہیروئین ایک پاؤڈر ہے جسے بنانے والے دو تین درجوں میں تیار کرتے ہیں۔ ہیرون کی ایجاد 1885ء میں ایک جرمن دواساز کمپنی بائیر نے کی تھی اور یہ دوا نزلہ، زکام اور ایسی ہی دیگر بیماریوں کے لیے استعمال کی جاتی رہی، کم اَز کم پچاس برس یہ دوا کھلے عام استعمال ہوتی رہی مگر 36-1935ء میں جرمنی کے چانسلر ہٹلر کو انفارم کیا گیا کہ یہ دوا انسانوں کی صحت اور زندگی کے لیے بہت خطرناک ہے جس پر ہٹلر نے 1936ء میں اس دوا کی جرمنی میں ممانعت کردی اور بائیر کمپنی کو حکم دیا کہ ایسی کوئی دوا نہ بنائی جائے مگر اس وقت تک یہ دوا بہت سے یورپی ممالک میں تیار کی جانے لگی تھی اور اسے دوا کی بجائے نشے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔

پوست ایسی فصل ہے کہ کاشت کرنے کے بعد اسے نہ تو گوڈی کی ضرورت ہے اور نہ کسی کھاد کی ضرورت ہے اور نہ ہی اسے کیڑا لگتا ہے اور نہ کم پانی سے اس پر کوئی برا اثر پڑتا ہے۔ کاشت کار پوست کاشت کرنے کے بعد فصل سے بے فکر ہو جاتا ہے۔

پاکستان میں ہیروئین کا استعمال 1981ء میں شروع ہوا اور ان پچیس سالوں میں اتنا پھیل گیا ہے کہ پچاس لاکھ افراد اس کے عادی ہو چکے ہیں، 1979ء میں جب افیون عام ملتی تھی لوگوں کو اس سے کوئی رغبت نہ تھی لیکن عالمی سطح پر جب اس کا پروپیگنڈہ کیا گیا تو راتوں رات امیر بن جانے کی ہوس میں مبتلا لوگ ڈرگ مافیا کے ممبران کے ساتھی بن گئے اور ان کے جال میں ایسے پھنسے کہ پھر نکلنا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔ منشیات کے پھیلاؤ کے اسباب میں تجسس، جذباتی دباؤ، سماجی دباؤ، حلقۂ احباب، خوشی، فیشن، فارغ البالی، ناکامی، جنسی بے راہروی اور سگریٹ نوشی مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ منشیات سوسائٹی پر بہت برے اثرات مرتب کر رہی ہے جو درج ذیل ہیں۔

1- ہیروئین کے استعمال سے جسم میں خون کے سرذرات کم ہو جاتے ہیں اور جسم انتہائی کمزور اور لاغر ہو جاتا ہے۔

2- معدہ اور آنتیں زخمی ہو جاتی ہیں اور ان کا السر کسی بھی وقت کینسر میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

3- جسم میں رعشہ، آنکھوں کی چمک دمک ختم ہونا، ناک کے پردہ میں سوراخ، دل

اور جگر کو نقصان پہنچاتا ہے۔

4- مرگی اور تشنج کے دورے شروع ہو جاتے ہیں۔

5- ہیروئین کا عادی خوراک کھانے کے قابل نہیں رہتا، بھوک ختم ہو جاتی ہے، شادی شدہ آدمی چار سال کے اندر اندر موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔

انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو سب سے پہلے افیون کی تجارت کو قابو کیا اور کاشت کاروں پر پابندی لگا دی کہ وہ صرف انگلش سرکار کو تمام کی تمام فصل فروخت کریں۔ مقامی آبادی کو وہ ڈپوؤں کے ذریعہ لائسنس ہولڈرز کو معمولی مقدار مہیا کر کے باقی چین اور دوسرے ممالک کو برآمد کرتے۔ یہ مقدار بلا مبالغہ ٹنوں کے حساب سے چین بھیجی جاتی تھی۔ ہندوستان سے ہونے والی آمدن کا بیس فیصد انگریزوں کو افیون کی تجارت سے حاصل ہوتا تھا۔ افیون اور اس کی دیگر منشیاتی مصنوعات کو انسانی صحت کے لیے آبِ حیات کا متبادل قرار دے کر اہلِ چین کی بہت بھاری اکثریت کو افیون اور پوست کا عادی بنا دیا گیا اور وہیں سے یہ وبا نکل کر چین سے ملحقہ قبائلی علاقوں تک پھیل گئی۔ چین میں انگریزوں نے افیون کی کاشت کے خلاف مزحمت کرنے والے چینیوں کے خلاف جنگیں بھی لڑی جنھیں تاریخ کے صفحات پر ''اوپیئم وارز'' کے عنوان سے دیکھا جا سکتا ہے۔ چین کے ساتھ ساتھ افیون کی کاشت برما، الاؤس اور وسطِ ایشیا کی متعدد ریاستوں تک باقاعدہ انگریزوں اور ولندیزی حکمرانوں کی سرپرستی میں ہوتی رہی ہے۔ ہانگ کانگ پر برطانوی قبضہ بھی اسی عرصہ میں عمل میں آیا۔ چینیوں نے آج سے ستر برق قبل سنبھلنا شروع کر دیا اور چین میں آنجہانی چیئرمین ماوزے تنگ اور چورین لائی کی قیادت میں افیون کے خلاف جدوجہد شروع کی گئی کمیونسٹ لیڈر شپ نے بتدریج اقتدار حاصل کیا اس طرح وہاں سے افیون کی کاشت کو بھی ختم کر کے آہستہ آہستہ مقامی اور قومی اشیائے خوردنی کی پیداوار کو ترجیح دی گئی، اس کے لیے باقاعدہ اقدامات کیے گئے۔

عالمی طاقتیں جب چاہیں کمزور اور زیر دست قوموں کو جس برائی میں چاہیں مبتلا کر دیتی ہیں، اس وقت امریکی ماہرین ہیروئین کے انسداد اور افیون کی کاشت کے خلاف

مہم چلا رہے ہیں، یقیناً ان میں سے کئی کے آباؤ اجداد وہی انگریز ہوں گے جنھوں نے اپنے مفادات کے لیے چین اور دوسرے کئی ممالک میں افیون کی کاشت کی حوصلہ افزائی کی اور اس کے لیے باقاعدہ جنگیں لڑی ہوں گی۔

ولیم بیلم نے اپنی کتاب ''روگ سٹیٹ'' کے باب 24 ''سی آئی اے اور منشیات'' میں ڈینس ڈیل، سابق چیف ڈی ای اے یونٹ کے بیان کا حوالہ دیا ہے جس میں انھوں نے فرمایا کہ ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن اور متعلقہ ایجنسیوں میں میرے تیس سالوں کے دوران وہ اہم نام جو میری تحقیقات کا نشانہ بنے تقریباً سب ہی مستقل طور پر سی آئی اے کے لیے کام کر رہے تھے۔ ان کے مندرجہ بالا بیان سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عالمی طاقتیں نہیں چاہتیں کہ منشیات کی سمگلنگ ختم ہو، سی آئی اے نے منشیات کی سمگلنگ میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

1- فرانس میں 51-1947ء کے دوران ہیروئین ایکٹ کو زندہ کیا اور مزدور یونینوں کے خلاف استعمال کیا۔

2- 70-1950ء کے دوران سی آئی اے نے برما، تھائی لینڈ اور لاؤس میں ہیروئین تاجروں کی مدد کی اور اپنا حصہ وصول کیا۔

3-80-1973ء کے عرصہ میں آسٹریلیا کے بینک نوگان ہیڈ بینک کے سی آئی اے کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے، اسلحہ بیوپاریوں اور منشیات کے سمگلروں کے لیے 80-1973ء کے دوران یہ ایک محفوظ بینک رہا۔

4- 80-1970ء کے عرصہ کے دوران سی آئی اے نے پانامہ کے سربراہ جنرل نوریگا اور ان کی ٹیم کو منشیات کی سمگلنگ میں استعمال کیا۔

5- 90-1980ء افغان وار میں زیادہ تر رقم سی آئی اے نے منشیات کی سمگلنگ سے حاصل کی۔

پوری دنیا میں اس وقت ہیروئین کی تجارت کی مالیت 225000000000 ڈالر ہے۔ اس رقم کا اسی فیصد عالمی طاقتوں کے بینکوں میں جمع ہے اور وہی اس رقم سے فائدہ

اٹھارہی ہیں۔امریکہ اور برطانیہ کے دانشور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد پوری دنیا میں آزاد معاشی نظام کے قیام کے لیے راستہ ہموار کررہے ہیں۔امریکہ اور برطانیہ منشیات کی تجارت کے ساتھ ساتھ تیل اور گیس کی تجارت پر بھی مکمل کنٹرول کی کوشش کررہے ہی،اس سلسلہ میں انھوں نے اسلامی ممالک کو چنا ہے کیونکہ فوجی لحاظ سے کمزور مگر تیل اور گیس کی دولت سے مالا مال ہیں،ان کو مفتوح بنانا نہایت آسان ہے،اس سلسلہ میں ان کا پہلا نشانہ افغانستان تھا،اب عراق بھی فتح ہو چکا ہے،قطر،سعودی عرب اور کویت وغیرہ میں امریکہ اور اس کے یورپی حلیف ممالک کی افواج ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔

ترقی پذیر ممالک کو مشترکہ لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا تاکہ منشیات کی لعنت سے انسانوں کو پاک کیا جائے،لوگوں کو منشیات کے نقصانات بتانا ہوں گے،عالمی طاقتوں اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان بنیادی فرق سائنس کا ہے،سائنسی تعلیم ہی کی وجہ سے امریکہ اور اس کے اتحادی طاقتور ہیں سائنس کی تعلیم کو فروغ دینا ہوگا کیونکہ امن طاقت کے توازن کا نام ہے۔۔۔۔۔!!

ملٹی نیشنل کمپنیاں، میڈیسن اور پاکستان

ملٹی نیشنل کمپنیوں کے آنے سے پہلے برِصغیر میں خالص خوراک ایک عام آدمی کو میسر تھی ادویات بھی خالص تھیں۔ خالص خوراک اور خالص ادویات کی وجہ سے پیچیدہ بیماریاں کم تھیں، اب پاکستان میں ایک عام انسان کو خالص خوراک اور خالص ادویات میسر نہیں ،اسی وجہ سے ہیپاٹائٹس، بلڈ پریشر، شوگر، ایڈز اور دل کی بیماریاں عام ہوئی ہیں۔ میڈیسن کی مشہور چار اقسام ہیں۔

1- ایلو پیتھک میڈیسن

2- ہومیو پیتھک میڈیسن

3- دیسی میڈیسن

4- زرعی میڈیسن

پاکستان میں دواساز ملٹی نیشنل کمپنیوں نے ایوب خاں کے دور میں قدم جمانے شروع کیے، گزشتہ چند سالوں میں دواسازی کے کاروبار کی بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ 1971ء میں دوائیوں کی کل فروخت 40 کروڑ روپے تھی، 1981ء میں ادویات کی کل فروخت 4 ارب روپے تھی جو کہ 2002ء میں تقریباً 50 ارب روپے کے قریب پہنچ چکی گئی، ان میں 40 ارب روپے کی میڈیسن ملٹی نیشنل کمپنیوں نے 2002ء میں سیل کیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں میں وائتھ، گلیکسو، سینڈوز، پارک ڈیوس، بائر، فائزر اور ویلکم وغیرہ شامل ہیں یہ مالی اعتبار سے اتنی بڑی کمپنیاں ہیں کہ ان کا پاکستان میں مقابلہ کرنے کا کوئی دواساز ادارہ تصور بھی نہیں کرسکتا۔ 2002ء میں تقریباً 11 ارب روپے کی زرعی ادویات بھی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے سیل کیں، ان کمپنیوں میں ایکسون، آئی سی آئی، بائر، سینڈوز، سیبا گائیگی شامل ہیں زرعی ادویات پیداوار میں تو اضافہ کر رہی ہیں لیکن ساتھ ہی بیماریوں کے پھیلاؤ کا بھی سبب

بن رہی ہیں۔

پاکستان میں موجودہ دواساز ملٹی نیشنل کمپنیوں کو اس لحاظ سے اجارہ داری حاصل ہے کہ تمام قیمتی ادویات کے برانڈ نیم ان کمپنیوں کے نام رجسٹرڈ ہیں جنھیں کوئی مقامی دواساز ادارہ تیار نہیں کرسکتا، ان میں زندگی بچانے والی میڈیسن شامل ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام ادویات جن کی فروخت سے سپر منافع ہوتا ہے صرف یہی کمپنیاں تیار کرنے کی مجاز ہیں ۔اربوں روپے کا منافع ہر سال پاکستان سے ملٹی نیشنل کمپنیاں باہر بھیج دیتی ہیں اور پاکستانی معیشت کو کمزور کرتی ہیں ملٹی نیشنل کمپنیاں پاکستان میں ادویات مہنگے داموں فروخت کررہی ہیں، مزید ظلم کی بات یہ ہے کہ یہ ادویات غیر معیاری ہوتی ہیں اسی وجہ سے پاکستان کا خوش حال طبقہ امپورٹڈ ادویات استعمال کرتا ہے حالانکہ ترقی یافتہ ممالک خود کو بہت ایماندار اور ہیومن رائٹس کا چمپئن گردانتے ہیں لیکن ان کی پالیسی اس کے برعکس ہے ہر ایلوپیتھک میڈیسن کے سائیڈ افیکٹس ہیں۔

پاکستان میں موجود کثیر القومی دواساز ادارے پاکستانی معیشت اور عوام کو کئی طریقوں سے استحصال کرتے ہیں مثلاً

i- ملٹی نیشنل کمپنیاں تقریباً تمام کیمیکلز اور ادویات کا خام مال بیرونِ ملک سے درآمد کرتی ہیں۔

ii- ان اداروں میں 75 فیصد کے قریب حصص غیر ملکیوں کے قبضے میں ہیں اور پاکستانی حصہ دار اقلیت میں ہیں جس کے نتیجہ میں تمام تر پالیسی کثیر القومی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔

iii- ملٹی نیشنل کمپنیاں ادویات کے اثرات کے دیکھنے کے لیے ترقی پذیر ملکوں کے عوام کو لیبارٹری کے طور پر بھی استعمال کرتی ہیں۔

iv- ترقی پذیر ممالک کے اکثریت ڈاکٹر ان کثیر القومی کمپنیوں کے سیلز مین بن کے رہ گئے ہیں۔

ان ڈاکٹروں کو ادویات کے مفت سمپل، خوبصورت کیلنڈر اور تحائف دیئے جاتے

ہیں، علاوہ ازیں نامور سپشلسٹ ڈاکٹروں کو ہوٹلنگ کی سہولت مہیا کی جاتی ہے، رشوت کے طور پر یورپ، آسٹریلیا اور امریکہ کے وزٹ کروائے جاتے ہیں۔

v۔ پاکستان میں مقامی افسر شاہی کو دواساز کمپنیاں مختلف طریقوں سے رشوت دیتی ہیں۔

vi۔ مضرِ صحت ادویات کا سٹاک یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں ترقی پذیر ممالک میں فروخت کر دیتی ہیں۔

vii۔ ہندوستان اور پاکستان کی ادویات کی قیمتوں کا اگر تقابل کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قیمتوں کا فرق 25 فیصد سے لے کر 100 فیصد تک ہے۔

viii۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں جنرک نیم یعنی کیمیکل نام کی بجائے برانڈ نیم سے ادویات مہنگے داموں پاکستان میں فروخت کر رہی ہیں۔

مندرجہ بالا استحصال کو ختم کیا جا سکتا ہے اور پاکستان ادویات میں درج ذیل طریقے سے خود کفیل ہو سکتا ہے۔

1947ء کی آزادی کے بعد سے آج تک ہم پاکستان میں ادویات کا خام مال تیار نہیں کر پائے پاکستان میں ملٹی نیشنل دواساز اداروں کو ڈرگ مینوفیکچرنگ کے لائسنس اس شرط پر دیئے گئے کہ وہ پاکستان میں ادویات کا خام مال بھی بنائیں گے مگر اس کے برعکس انھوں نے خام مال بنانے سے گریز کیا اور پاکستان میں انڈیا، چائنہ، کوریا اور تیسری دنیا کے مختلف ملکوں کا خام مال ملٹی نیشنل دواساز اداروں نے اپنے (Parent) کمپنیوں کے نام پر مہنگے داموں درآمد کر کے پاکستان کی معیشت کو زبردست نقصان پہنچایا اس کے برعکس انڈیا میں انھی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے ہندوستانی حکومت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور وہاں انھوں نے خام مال کی پیداوار شروع کر دی، اکثر پاکستانی دواساز ادارے ادویات مینوفیکچر نہیں کر رہے بلکہ صرف پیکنگ کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ملٹی نیشنل دواساز اداروں کو مجبور کیا جائے کہ وہ پاکستان میں خام مال تیار کریں جب ادویات کا خام مال پاکستان میں تیار ہوگا تو ادویات کے خام مال بنانے کے فارمولے پاکستانی ادویات ساز اداروں کے بھی ہاتھ لگ جائے گئے اس طرح ادویات سستی ہو جائے گی اور پاکستان ادویات میں خود کفیل

ہو جائے گا۔

ادویات کے علم کی منتقلی کے لیے پاکستانی ادویات ساز اداروں کو ایک معیاری ریسرچ سنٹر قائم کرنا چاہیے جو کہ ترقی یافتہ ممالک کی ادویات، چائینہ کی ادویات اور ہندوستانی ادویات کے فارمولوں کا جائزہ لے اور ہندوستانی ادویات ساز اداروں کی طرح ان یورپی ادویات کو پاکستان میں تیار کرنے کی کوشش کرے قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک پاکستانی ادویات ساز ادارے معیاری اینٹی بائیوٹک، امراضِ قلب، فشارِ خون، ذیابیطس، تپ دق اور دماغی امراض کی ادویات پاکستان میں تیار نہیں کر سکے ایک بہت نامور دیسی ادویات ساز ادارے کے کرتا دھرتا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سپر پاور کا آلہ کار تھا اس نے دیسی ادویات سازی کو پاکستان میں ترقی نہیں کرنے دی جبکہ چائینہ اور انڈیا میں ہر مرض کے لیے دیسی ادویات تیار ہو رہی ہیں اس کے برعکس پاکستان میں چند ایک بیماریوں کے لیے دیسی ادویات کو شافی تصور کیا جاتا ہے۔

سرجیکل گڈز اور سرجیکل انسٹرومنٹ کا 80 فیصد میٹریل امپورٹڈ ہے اس کی وجہ سے آپریشن مہنگا پڑتا ہے سرجیکل گڈز کا مین خام مال سٹین لیس سٹیل ہے، پاکستان میں معیاری سٹین لیس سٹیل نہیں بنتا، حکومتِ پاکستان کو سٹین لیس سٹیل انڈسٹری لگانے میں خاص رعایت دینی چاہیے اور اس کی ٹیکنالوجی کی منتقلی میں پاکستانی صنعت کاروں کی مدد کرنی چاہیے۔

پاکستان کے پاس اس وقت دنیا کے بہترین ڈاکٹرز ہیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ پاکستان ادویات میں خود کفیل نہیں ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ پاکستانی ڈاکٹر پاکستان میں پریکٹس کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ یہاں ان کی آمدنی یورپ کے ڈاکٹرز سے بہتر ہے کیونکہ یورپ کے ہسپتالوں میں، یورپ کے شہریوں کا کسی حد تک علاج فری ہے، پاکستان میں ہر نامور ڈاکٹر کی خواہش ہے کہ وہ ہسپتال انڈسٹری میں آئے۔ بعض ڈاکٹروں کا رجحان سی ایس ایس پی آفیسر بننے کی جانب ہے گورنمنٹ آف پاکستان کو چاہیے کہ ڈاکٹروں کو ادویات انڈسٹری میں لانے کی حوصلہ افزائی کرے اور انھیں آسان شرائط پر قرضہ دے۔

سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ افیون تباہی اور بربادی کی بجائے دکھوں کا مداوا کرنے کے

لیے استعمال کی جاسکتی ہے اس لیے اسے ''ایٹم برائے سکون'' کا نام دیا جاسکتا ہے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کی ڈرگ انورسمنٹ ایجنٹوں کی منفی پالیسیوں اور منفی کردار کی وجہ سے پاکستان قدرت کے اس عطیے سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھاسکا حالانکہ یہی وہ پوردا ہے جس سے ہیروئین حاصل کرنے کی بجائے مارفین، کوڈین اور تھیا بین جیسے مفید اور کارآمد عناصر حاصل کیے جاسکتے ہیں جو زندگی بچانے والی اور درد سے نجات حاصل کرنے والی ادویات کا ایک لازمی جزو ہے۔ ہندوستان پوست کے پودے سے نہ صرف کھانسی کی ادویات اور پین کلرز تیار کررہا ہے بلکہ انھیں ایکسپورٹ بھی کررہا ہے، پاکستانی کمپنیوں کو حکومتِ پاکستان کی مدد سے کھانسی کی ادویات، پین کلرز ادویات اور زندگی بچانے والی ادویات تیار کرنی چاہئے اور انھیں ایکسپورٹ کرکے زرِمبادلہ میں اضافہ کرنا چاہئے اگر حکومتِ پاکستان مندرجہ بالا تجاویز کو عملی شکل پہنچائے تو پاکستان ادویات میں خود کفیل ہوسکتا ہے اور جس کا نتیجہ یقیناً سستی ادویات کی شکل میں سامنے آئے گا۔

پاکستان زراعت میں کیوں خود کفیل نہ ہوسکا؟

جب شکاری سماج زرعی سماج میں تبدیل ہوا تو زرعی سماج کی وراثتی اور قبائلی نظام کے اقدار نے شکاری معاشرت کی غیر خاندانی اور وحشیانہ تما اقدار کا تختہ اُلٹ کر انھیں ناکارہ بنادیا۔ زراعت کی ابتدا وادی دجلہ وفرات (عراق) سے ہوئی کیونکہ یہ وادی تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار برس پرانی ہے۔ شروع میں انسان صرف گیہوں اور جو کے جنگلی پودے پر گزارا کرتا تھا، آہستہ آہستہ اُسے بیج بونا اور فصلیں اُگانا سمجھ میں آ گیا۔ علماء عمرانیات کا کہنا ہے کہ زراعت عورتوں کی ایجاد ہے اور مویشی پالنا بھی ہمیں عورتوں نے سکھایا ہے کیونکہ مرد شکار کے لیے جنگلوں میں چلے جاتے تھے اور عورتیں گھر میں اکیلی رہ جاتی تھی، زرعی نظام کی وجہ سے عورت کی اہمیت بڑھ گئی، زمین کو عورت سے تشبیہ دی گئی کیونکہ زمین اناج اور عورت انسان پیدا کرتی ہے۔ زراعت اور مذہب نے جاگیردارنہ نظام کی بنیاد رکھی بعدازاں جاگیردارنہ نظام اور قبائلی نظام کی وجہ سے ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ پاکستان کی معیشت میں زراعت کی بہت اہمیت ہے، جی ڈی پی کا 25 فیصد زراعت سے حاصل ہوتا ہے مگر اس پر 70 فیصد آبادی کا انحصار ہے۔

پاکستان زراعت میں کیوں خود کفیل نہ ہوسکا یا زراعت پاکستان کی معاشی ترقی میں کیوں اہم کردار ادا نہ کرسکی، اس کی درج ذیل وجوہات ہیں۔

ہر سال تقریباً 11 ارب روپے کیڑے مار ادویات کے نام پر بین الاقوامی کمپنیوں کی جیب میں چلے جاتے ہیں، اسی طرح کیمیائی کھاد کے نام پر بھی سالانہ اربوں روپے ملٹی نیشنل کمپنیاں پاکستان سے کمارہی ہیں۔ ابتدا میں مفت فراہم کردہ کھادیں اور زرعی ادویات اب اتنی مہنگی ہوگئی ہیں کہ پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور سری لنکا میں زراعت گھاٹے کا سودا بن گئی ہے۔ امریکہ اور مغرب کی کمپنیاں جین بینک کے نام پر فصلوں کے بیج

اپنے ملک لے جا رہی ہیں، امریکہ میں بیج پر ایسی ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے جس کے استعمال سے کسان کی فصل تو پیدا ہوگی مگر اگلے سال وہ اس بیج کو بوئے گا تو پیداوار نہیں ہوگی، تمام قسم کا یرقان (ہیپا ٹائیٹس) اور گردے کی بیماریاں کیمیائی کھاد اور کیڑے مار ادویات کی وجہ سے ہو رہی ہیں مزید ظلم کی بات یہ ہے کہ یرقان اور گردے کی بیماریوں کی ادویات پر بھی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا کنٹرول ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ ایشیائی ممالک روایتی کاشت کاری کے طریقے اپنالیں اور اجتماعی خودکشی سے بچیں۔

یہ کیسی عجیب فلاسفی ہے کہ صنعتی اشیاء پر ربیٹ اور ڈیوٹی ڈار بیک دیا جاتا ہے لیکن زرعی اشیاء پر ربیٹ اور ڈیوٹی ڈرا بیک نہیں دیا جاتا حالانکہ زرعی اشیاء کی پیداوار پر زمیندار کھاد کی صورت میں اور زرعی ادویات کی صورت میں ٹیکس ادا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں زمیندار فصل پر کئی صوبائی ٹیکس بھی ادا کرتا ہے، اگر صنعتی اشیاء کی طرح زرعی اشیاء پر ڈیوٹی ڈرا بیک دیا جائے تو پاکستان میں زراعت کی حوصلہ افزائی ہوگی، اس طرح پاکستان زراعت میں خودکفیل ہو جائے گا۔

1857ء میں غداری کے سلسلہ میں انگریزوں نے برِصغیر کے غداروں کو جاگیریں عطا کیں اور جاگیردارنہ نظام کی مضبوط بنیاد ڈالی ان غیر حاضر زمینداروں کی وجہ سے 20 لاکھ ایکڑ رقبے پر کوئی فصل کاشت نہیں کی جاتی۔ جاگیردارنہ نظام کی وجہ سے بھی زرعی پسماندگی ہے۔ انڈیا میں جاگیردارانہ نظام جواہر لال نہرو کے دور سے ختم ہو چکا ہے، یہاں بھی ضرورت ہے کہ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ کیا جائے اور 20 لاکھ ایکڑ جس پر کوئی فصل کاشت نہیں ہوتی فصل کاشت کی جائے تا کہ پاکستان زرعی پیداوار میں خودکفیل ہو سکے۔

پاکستان میں کاشت کا جو طریقہ پیدائش استعمال کیا جاتا ہے وہ بہت دقیانوس اور غیر سائنسی ہے، پاکستان میں آلاتِ کاشت کاری بوسیدہ اور دقیانوسی ہیں، ان کی مدد سے وقت اور محنت زیادہ لگتی ہے لیکن زمین کی تیاری اچھی نہیں کی جاسکتی اس طرح زمین بہت کم پیداوار دیتی ہے۔ ضرورت ہے کہ چھوٹے زمینداروں کو آسان شرائط پر ٹیوب ویل، ٹریکٹر کے لیے قرضے دیئے جائیں، بجلی کے نرخ کم رکھے جائیں اور ڈیزل مناسب ریٹ پر سپلائی

کیا جائے۔

آج ہر فصل کا کسان صنعت کار کے سات دست وگریبان ہے، مثلاً کماد کا کاشت کار شوگر مل والوں سے لڑ رہا ہے، کپاس والا جننگ فیکٹری اور ٹیکسٹائل مل والے پر ناراض ہے وغیرہ وغیرہ، صنعت کار کسانوں کو صرف ایک چٹ دے دیتے ہیں اس کو کیش اپنی مرضی سے کرتے ہیں، اس کریڈٹ سسٹم کی وجہ سے کاشت کاروں کے حوصلے پست ہو رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ صنعت کاروں کو پابند کیا جائے کہ وہ کاشت کاروں کو بائی نیم چیک دیں اگر وہ کیش نہ ہوں تو گورنمنٹ ان نام نہاد صنعت کاروں کے خلاف سخت ایکشن لے اس عمل سے کاشت کاروں کی حوصلہ افزائی ہوگی اور زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔

پاکستانی معیشت کو سیم اور تھور اندر ہی اندر سے گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے، لاکھوں ایکڑ اراضی سیم وتھور کی نذر ہو چکی ہے اور مزید زمین سیم کی زد میں آ رہی ہے، زمین ساحل کے کٹاؤ کی وجہ سے بھی متاثر ہو رہی ہے۔ حکومت پاکستان سیم وتھور کی روک تھام کے لیے مناسب منصوبہ بندی کرے، سیم نالیاں کھودیں، ٹیوب ویل لگوائے، تھور کا علاج جپسم پورڈر سے کرے۔ علاوہ ازیں آب پاشی کی سہولتیں بھی ناکافی ہیں، حکومت پاکستان کو چاہیے بہترین نہریں اور چھوٹے چھوٹے ڈیم بنائے تاکہ زرعی پیداوار میں اضافہ ہو۔

پاکستان میں کسان کا سب سے بڑا سرمایہ اُس کے حیوانات ہوتے ہیں، لیکن ایک تو حیوانات کی نسلیں اچھی نہیں ہیں دوسرے بیماری کی وجہ سے مرنے والے حیوانات کا تناسب بہت زیادہ ہے اور تیسرے ان کی استعداد کار کم ہے، حیوانات کے شفاخانے ضرورت سے کم ہیں، حکومت کو چاہیے کہ ان شفاخانوں میں اضافہ کرے، حیوانات کی پرورش گاہوں میں اضافہ کرے، مچھلی گاہوں کے بنانے کے لیے مناسب منصوبہ بندی کرے، پولٹری فارم بنوائے، معدنیات کو تلاش کرے، مناسب منصوبہ بندی کی وجہ سے حیوانات مچھلی، چکن اور معدنیات کی ایکسپورٹ میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

کسان کی محنت کا بڑا حصہ مڈل مین کو چلا جاتا ہے، قیمتوں کا نظام غیر منصفانہ ہے۔ فوڈ

اینڈ فوڈ پراڈکٹس پر ملٹی نیشنل کمپنی نیسلے (Nestle) کنٹرول کر رہی ہے نیسلے کی مصنوعات میں منرل واٹر، ملک پیک، بالائی پیک، دیسی گھی، چائے کے لیے خشک دودھ، بچوں کے لیے خشک دودھ، شیر خوار بچوں کے لیے خوراک، بچوں کے لیے چاکلیٹ اور کینڈی وغیرہ وغیرہ موجود ہیں، یعنی زرعی پیداوار سے خالص منافع نیسلے (Nestle) ملٹی نیشنل کمپنی کمارہی ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں لیز پر زمین لینے کی بھی کوشش کر رہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ملکی زرعی صنعت کو فروغ دیا جائے تا کہ سرمایہ ملک کے اندر رہے اور ملک معاشی ترقی کرے۔ اگر ملکی زرعی صنعت کو فروغ نہ دیا گیا تو زراعت میں مستور بے روزگاری کی شرح میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا جو ملک کے لیے انتہائی خطرناک ہے، بے شک کسی بھی آزاد ملک کے زندہ رہنے کے لیے دو چیزوں یعنی خوراک اور اسلحہ کی اَشد ضرورت ہوتی ہے۔ ایران اور شمالی کوریا پر سپر پاورز نے تجارتی پابندیاں لگائی ہوئی ہیں، یہ ملک زراعت اور اسلحہ کی خود کفالت کی وجہ سے ہی سامراجی ممالک کی مضبوط گرفت سے بچ گئے ہیں، امریکہ بھی اس لیے سپر پاور ہے کہ وہ زراعت اور اسلحہ میں خود کفیل ہے۔ اب پاکستان میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے راستے پاکستان کی زراعت پر قبضہ، ترقی یافتہ ممالک کا خواب ہے۔ پاکستان کی ایٹمی ٹیکنالوجی پر کنٹرول کرنے کے لیے بھی ترقی یافتہ ممالک جواز ڈھونڈ رہے ہیں، ان دونوں حملوں سے پاکستان کو بچانا ہے، اُمید ہے حکومتِ پاکستان مناسب منصوبہ بندی سے بیرونی سازشوں کو ناکام بنادے گی اور پاکستان خود کفیل ملک بن جائے گا۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کا معاشی ترقی میں کردار

معلومات کی منتقلی کے لیے انسان نے مختلف ادوار میں مختلف طریقے اختیار کیے ،سقراط معلومات کی منتقلی کے لیے اپنے شاگردوں کو لیکچر دیا کرتا تھا اس نے کوئی کتاب تحریر نہیں کی ہے مگر اس کے شاگرد افلاطون نے معلومات کی منتقلی کے لیے ہاتھ سے کتابوں کی کتابت کی اس کے بعد پرنٹنگ پریس کا دور آیا، علم عام ہوا اور انسانی زندگی میں انقلاب آ گیا۔اب کمپیوٹر کا دور ہے کمپیوٹر کے ذریعے پیغام رسانی / معلومات کا تبادلہ کرنے کا نام ہی انفارمیشن ٹیکنالوجی ہے۔1946ء میں پہلا الیکٹرانک کمپیوٹر ایجاد ہوا جس کی یاداشت صرف 20 الفاظ پر مشتمل تھی مگر اس شعبہ میں اصل انقلاب 1960ء کی دہائی میں آیا، اہم سنگِ میل 1971ء میں مائیکرو پراسیس کی ایجاد نے عبور کیا۔کمپیوٹر اب ہر تعلیم یافتہ آدمی کی ضرورت بن گیا ہے، اس وقت دنیا میں 31 کروڑ کمپیوٹر کام کر رہے ہیں، ترقی یافتہ ممالک کی معاشی ترقی میں کمپیوٹر نے اہم کردار ادا کیا ہے، پاکستان کی معاشی ترقی میں اگر انفارمیشن ٹیکنالونی کو ایک سسٹم کے مطابق استعمال کیا جائے تو انفارمیشن ٹیکنالوجی معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

ترقی یافتہ ممالک نے اپنی ایکسپورٹ کے بڑھانے کے لیے کامرس ویب سائٹ تیار کی ہوئی ہے، جس میں امپورٹ اور ایکسپورٹ کے بارے میں مکمل عالمی معلومات ہوتی ہیں، پاکستان کی وزارتِ تجارت کو بھی چاہیئے کہ وہ پاکستان کے انڈسٹریلیسٹ کو امپورٹ اور ایکسپورٹ کے بارے میں گائیڈ کرے ، یہ سہولتیں انٹرنیٹ پر دے، جب بھی کوئی ایکسپورٹر ایکسپورٹ کے بارے میں انفارمیشن مانگے تو اسے فوراً انفارمیشن دی جائے کہ فلاں ملک میں فلاں شے کی کتنی ڈیمانڈ ہے اور وہاں فلاں شے کا فلاں ریٹ ہے۔اسی طرح انفارمیشن ٹیکنالوجی کی بدولت ایکسپورٹ میں اضافہ ہوگا، مختلف امپورٹ آئٹم پر ڈیوٹی کی

شرح کتنی ہے اور مختلف آئٹم کی ویلیو کیسے تعین کرنی ہے۔اس کے لیے سنٹرل بورڈ آف ریونیو پاکستان نے انٹرنیٹ پر سہولت دے رکھی ہے جس سے محکمہ کسٹم کے آفیسرز اور امپورٹر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

حکومتِ پاکستان مختلف اسامیوں کے لیے مختلف اخبارات میں اشتہارات دیتی ہے جس پر سالانہ کروڑوں روپیہ خرچ آتا ہے، حکومتِ پاکستان کے کروڑوں روپے کی بچت ہوسکتی ہے اگر وہ اسامیوں کے لیے ایک علیحدہ ایمپلائمنٹ ویب سائٹ تیار کرے جب درخواستیں بھیجنے کی تاریخ ختم ہوجائے تو ان اسامیوں کو ایمپلائمنٹ ویب سائٹ سے نکال دیا جائے اور جب نئی اسامیاں گورنمنٹ آف پاکستان اناؤنس کرے تو اس کو ایمپلائمنٹ ویب سائٹ میں فیڈ کردیا جائے اس طرح مختلف محکموں کے ٹینڈر نوٹس اخبارات میں چھپتے ہیں ان اشتہارات کے بل کروڑوں روپوں میں ادا کیے جاتے ہیں، اس کے لیے حکومت پاکستان ٹینڈر نوٹس ویب سائٹ بنادے تو اس سے حکومت کے سرمایہ کی بچت ہوگی اور اشیاء کے مکمل مقابلہ کی صورت میں حکومت کو معقول آمدنی بھی حاصل ہوجائے گی۔

پاکستان میں مختلف قسم کی دہشت گری ہورہی ہے مختلف دہشت گردوں کے سر کی قیمت لاکھوں میں ہے ان کے اشتہارات اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں جن کا سالانہ بل کروڑوں میں ادا کرنا پڑتا ہے لیکن فوائد اتنے حاصل نہیں ہورہے جتنے کہ ہونے چاہئیں، محکمہ پولیس کو چاہئے ہ وہ کرمنل ویب سائٹ تیار کرے اس طرح حکومت کے سرمایہ کی بچت بھی ہوگی اور مجرموں کو تلاش کرنے میں مدد بھی ملے گی۔امریکہ اور یورپی ممالک نے ایسی ویب سائٹ تیار کی ہوئی ہے۔ریلوے کا ٹائم ٹیبل اور پاکستان کی تمام پاکستانی ائیرلائنوں کے ٹائم ٹیبل کی ٹائم ٹیبل ویب سائٹ تیار کی جائے اس طرح حکومت کی آمدنی میں معقول اضافہ ہوگا کیونکہ مسافروں کو گھر بیٹھے ہی ٹائم ٹیبل معلوم ہوجائے گا اور کس ٹرین اور کس ائیرلائن میں سیٹ خالی ہے معلوم ہوجائے گا۔

صنعتی ترقی کے لیے ویب سائٹ تیار کی جائے جس میں مکمل معلومات دی جائیں۔پاکستان کی تمام صنعتوں کی تفصیل ہو، مختلف شہروں میں جو مختلف صنعتیں ہیں ان کی

تفصیل شائع کی جائے اسی طرح صنعتوں کو آئٹم وائز بھی شائع کیا جائے، خام مال کہاں مہیا ہوتا ہے اس کی تفصیل دی جائے، کل پیداوار کا تعین کیا جائے اور کتنی صنعتی پیداوار کی پاکستان کو ضرورت ہے اور کتنی صنعتی پیداوار امپورٹ کرنی چاہئے، انٹرنیٹ پر اس کی تفصیل شائع کی جائے اس طرح پاکستان مختلف صنعتی بحرانوں سے بچ جائے گا جیسے کہ ایک سال پاکستان نے چینی ایکسپورٹ کی لیکن دوسرے ہی سال چینی امپورٹ کی ناقص منصوبہ بندی کی وجہ سے۔ جاپان سالانہ منصوبہ بندی کرتا ہے کہ کس شے کی کتنی پیداوار کرنی ہے، ملک کے اندر کتنی پیداوار فروخت کرنی ہے اور کتنی پیداوار ایکسپورٹ کرنی ہے اور کس ملک میں ایکسپورٹ کرنی ہے، پاکستان میں بھی ایسی ہی تفصیل فراہم کرنے والی صنعتی ویب سائٹ تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

زرعی ترقی کے لیے زرعی منسٹری کو ایگری کلچر ویب سائٹ تیار کرنے کی ضرورت ہے جس میں مختلف شہروں کی مختلف زمینوں کی خصوصیات درج ہوں، فی کس پیداوار میں کیسے اضافہ کیا جاسکتا ہے، سیم اور تھور کو کیسے ختم کیا جاسکتا ہے کی تفصیل شائع کی جائے، کون سا بیج کہاں استعمال کرنا ہے کی تفصیل دی جائے، علاج و معالجہ کی سہولت کے لیے ہیلتھ ویب سائٹ تیار کی جائے جس میں مختلف بیماریوں کے مختلف ڈاکٹروں کی تفصیل دی جائے تاکہ عوام صحیح ڈاکٹر سے رابطہ کرسکیں، محکمہ ایجوکیشن کو چاہئے کہ وہ ایجوکیشن ویب سائٹ تیار کرے جس میں ایجوکیشن کے تمام اداروں کی تفصیل ہو اور مختلف مضامین پر روشنی ڈالے، پاکستان میں ان کی ضرورت کی ہے اور بیرونِ ملک کیا مستقبل ہے، ویب سائٹ پر انفارم کرے تاکہ طالب علم صحیح فیصلہ کرسکیں۔

اس وقت پاکستان کے ہر بڑے شہر میں کمپیوٹر ٹریننگ سنٹر ہیں اور ہر بڑے شہر میں انٹرنیٹ کلب ہیں، انٹرنیٹ کو اس وقت ترقی یافتہ ممالک جاسوسی کے لیے بھی استعمال کررہے ہیں۔ پاکستان کے محکموں کو چاہئے کہ وہ کوئی بھی ٹاپ سیکرٹ انفارمیشن کمپیوٹر میں فیڈ نہ کرے کیونکہ انفارمیشن چوری ہونے کا خطرہ ہے۔ حکومتِ پاکستان کو چاہئے کہ وہ صرف انفارمیشن ٹیکنالوجی کے آپریٹر ہی پیدا نہ کرے بلکہ کمپیوٹر مینوفیکچرنگ کی صنعت میں

بھی قدم رکھے۔امریکہ کا بل گیٹس دنیا کا امیر ترین شخص صرف کمپیوٹر مینوفیکچرنگ کی وجہ سے ہی بنا ہے، کمپیوٹر کی صنعت میں آنے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان میں سائنسی کلچر پیدا کیا جائے کیونکہ سائنس تھیوری دیتی ہے، ٹیکنالوجی اس کو عمل میں ڈھالتی ہے، درس گاہیں اس ٹیکنالوجی کے ماہر تیار کرتی ہیں، صنعت کار اس پر سرمایہ لگا کر صنعتوں کی تجدید کرتے ہیں، اس طرح نئی ٹیکنالوجی سماج میں جذب ہو کر اس کی قوت میں اضافہ کرتی ہے جس سے سائنسی تحریک کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور ملک معاشی ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔

کرپشن کریسی

جب سے زندگی پیدا ہوئی ہے کرپشن جاری ہے۔ کرپشن ترقی یافتہ ممالک میں بہت کم مقدار میں پائی جاتی ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک کی ہر فیلڈ میں کرپشن موجود ہے۔ یہ کیوں اور کیسے پیدا ہوتی ہے کن لوگوں نے پیدا کی ہے کس نظام کے تحت یہ زیادہ پھیلتی ہے اور اسے کیسے روکا جا سکتا ہے اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

جس ادارہ نے منصوبہ بندی کے تحت برِصغیر میں کرپشن پھیلائی اس کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی ہے یہ کمپنی ملکہ الزبتھ اول کے عہد میں ہندوستان میں تجارت کرنے کے بہانے 1600ء میں آئی اور اس نے 1613ء میں سورت کے مقام پر پہلی کوٹھی قائم کی یہاں اس کمپنی نے کرائے کے فوجی باقاعدہ عسکریت تربیت دے کر چھوٹی ریاستوں کو لڑائی میں مدد کرنے کے لیے معقول معاوضہ لے کر بھیجنے شروع کیے۔ کمپنی نے جاگیرداروں ،وزیروں اور مشیروں کو تحائف دیئے اور کرپشن کی باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بنیاد رکھی۔ان مندرجہ بالا لوگوں سے وہ تمام مفادات حاصل کرتی یہ لوگ اس کمپنی کے لیے جاسوس کا کام بھی کرتے۔

دوسری جنگِ عظیم میں کسی برطانوی شہری نے چرچل سے پوچھا کہ کیا برطانیہ کو جنگ میں شکست ہو رہی ہے تو چرچل نے کہا کہ ہم جنگ نہیں ہار سکتے کیونکہ ہم نے ملک میں انصاف قائم کیا ہوا ہے، عوام ہمارے ساتھ ہیں، ہم کیسے جنگ ہار سکتے ہیں۔انگریز اپنے ملک کے اندر تو اانصاف مہیا کرتا ہے یعنی تعلیم فری، صحت فری، روزگار کی ضمانت اور سستا انصاف وغیرہ وغیرہ جبکہ ترقی پذیر ممالک میں یہ ترقی یافتہ ممالک انصاف کی فضا ہموار نہیں ہونے دیتے اور ہر ادارے کو کرپٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندوستان بننے کے بعد نہرو نے اپنی حکومت کے دوران سب سے پہلے جاگیردارانہ

نظام کا خاتمہ کیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ نہ تو عوام کو تعلیم دینے دیتے ہیں اور نہ ہی لوگوں کو صحت مند رہنے میں مدد کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ابھی تک جاگیر دارانہ نظام موجود ہے، پاکستان میں چاہئے تو یہ تھا کہ جن لوگوں نے 1857ء کی جنگ میں غداری کی اور اس صلہ میں جاگیریں حاصل کی ان سے پاکستان بننے کو فوراً بعد جاگیریں چھین لی جاتیں، لیکن ایسا نہ ہو سکا یہ لوگ ہر شعبہ زندگی میں پھیل گئے اور کرپشن کی ایک زنجیر بن گئی جسے ہم کرپشن کریسی کہہ سکتے ہیں۔ ان کے خلاف ابھی تک کوئی ایکشن نہیں لیا گیا اور نہ ہی 1857ء کی جنگ میں جنھوں نے شہادت حاصل کی انھیں ایوارڈ دیا گیا اور نہ ہی ان کی تشہیر کی گئی۔

Discretion power creates corruption کرپشن کی یہ ایک اہم وجہ ہے اس سے مراد فیصلہ کی آزادی (Liberty of decision) یہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اثر انداز ہوتی ہے۔

بیوروکریسی کے پاس فیصلہ کی آزادی کی طاقت ہے، آفیسرز اپنی مرضی سے جرمانہ کم اَز کم یا زیادہ سے زیادہ کر سکتے ہیں یہ طاقت تقریباً ہر سی ایس پی آفیسر کے پاس ہے اگر جرمانہ کی ایک حد مقرر کر دی جائے تو کرپشن کم ہو سکتی ہے کیونکہ اسی Discretion power سے بیوروکریسی مالی فائدہ اٹھاتی ہے۔ اسی طرح پولیس کے پاس ایف آئی آر کا Discretion power ہے اور یہی طاقت تفتیشی آفیسر کے پاس ہے۔

سیاستدان سیاست کو عبادت اور خدمت کا نام دیتے ہیں لیکن عملی طور پر وہ ایک بزنس سمجھ کر کرتے ہیں اگر سیاست خدمت کا نام ہے تو سیاستدان کی یہ کوشش ہو کہ ہر ایک شخص خدمت کے لیے اقتدار میں آئے لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے کیونکہ جمہوریت ایک لالچ کی زنجیر ہے۔ جب الیکشن ہوتے ہیں تو علاقے کی اہم شخصیت (Key Person) اپنی پسند کی ایک پارٹی کی الیکشن مہم میں بھرپور طریقہ سے حصہ لیتا ہے، اسے لالچ ہوتا ہے کہ آئندہ بلدیاتی الیکشن میں اسے کونسلر کا ٹکٹ ملے گا اور وہ کونسلر بن کر بھرپور مالی فائدہ اٹھائے گا اسی طرح ایم پی اے اور ایم این اے اپنی پارٹی کے لیے اور اپنے مفاد کے لیے الیکشن لڑتا ہے۔ جیتنے کے بعد اسے ہر فیلڈ میں کوٹہ مل جاتا ہے، اس کوٹہ سے وہ مالی مفادات حاصل

کرسکتا ہے مثلاً مختلف محکموں میں اسے ملازمت کا کوٹہ مل جاتا ہے، وہ بغیر میرٹ کی سفارش کر کے اپنے پسندیدہ امیدوار کو ملازمت دلوا سکتا ہے اسی طرح مختلف فنڈ کا استعمال کرسکتا ہے اور ٹھیکیداروں کے ساتھ مل کر کمائی کرسکتا ہے۔ یہ کوٹہ سسٹم ایک سیاستدان کی Discretion power ہے جو کرپشن پھیلاتی ہے، اسے ختم ہونا چاہئے، ملازمت میں میرٹ ہونا چاہئے، سیاستدان کو پالیسی بنانے میں کردار ادا کرنا چاہئے جو کہ عام طور پر سیاستدان نہیں ادا کرتے اور نوکریاں میرٹ پر ملنی چاہئیں تا کہ سرکاری ملازم ملک سے مخلص ہو نہ کہ کسی مخصوص سیاستدان سے۔ پارلیمنٹ اور بیوروکریسی کے بعد تیسرا اہم ستون صحافت ہے، صحافت معلومات اور سچائی لوگوں کے پاس روزانہ پہنچانے کا ذریعہ ہے یہ خبر، آواز، الفاظ اور تصویر کی شکل میں ہوسکتی ہے لیکن ترقی پذیر ممالک میں یہ ایک تجارت بن گئی ہے، اخبارات پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔ تقریباً اکثریت اخبار جانبدار ہیں، اکثر صحافی کسی نہ کسی کے درباری ہیں، کوئی صنعت کار کا درباری تو کوئی سیاستدان اور بیوروکریٹ سے مفاد حاصل کر رہا ہے۔ صحافت ترقی پذیر ممالک میں مکمل تجارت بن چکی ہے، صحافت پر بھی چیک (Check) ہونا چاہئے تا کہ سچ اور جھوٹ کا فرق معلوم ہو سکے اور صحافی کو اپنے مفادات کے تحت لکھنے کی آزادی ختم ہونی چاہئے کیونکہ یہ کرپشن کریسی میں مدد کرتی ہے اور اچھے صحافی کو ایوارڈ ملنا چاہئے۔

بینک آفیسرز کو Discretion power ہے کہ وہ کسی صنعت کار، جاگیردار کو 3 فیصد سے لے کر 22 فیصد شرح سود پر قرضہ دیں اس کے علاوہ اگر صنعت کار دیوالیہ ہو جائے تو اسے بے شک معاف کر دیں، اس رعایت سے ہمارے ملک کے کئی صنعت کار کھربوں روپیہ لے کر فرار ہو گئے ہیں جبکہ ایران میں ایسے ہی ایک فراڈیئے صنعت کار کو اربوں روپے کی ایرانی رقم ہضم کرنے کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔ علاوہ ازیں صنعت کار کو پاکستان میں آزادی ہے کہ وہ اپنی اشیاء کی قیمت اپنی مرضی سے وصول کرسکتا ہے، ترقی پذیر ممالک میں شرح منافع کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، حالانکہ شرح منافع کی ایک حد مقرر ہونی چاہئے۔ اب فراڈ، سٹہ بازی، ذخیرہ اندوزی غرض ہر چیز کاروبار بن چکی ہے جو

کہ انتہائی غلط عمل ہے، اچھے صنعت کار اور بینکار کو ایوارڈ ملنا چاہئے جبکہ برے صنعت کار اور بینکار کو سزا ملنی چاہئے تا کہ برائی کی حوصلہ شکنی ہو۔

پاکستان میں وکیل کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ قاتل کا کیس لڑے کیونکہ وہ زیادہ فیس دیتا ہے جبکہ مقتول کا کیس لڑنے سے کم فیس ملتی ہے، یہی حال پورے معاشرے کا ہے تقریباً ہر آدمی ہر بڑے آدمی کو نوازنے کی کوشش کرتا ہے اس عمل سے وہ معاشرے میں اہم آدمی بننے کی کوشش کرتا ہے، سرکاری ملازموں کو معقول تنخواہ نہیں ملتی ہے اس لیے وہ ضرورتاً کرپشن کرتے ہیں، چند ایسے ملازم ہیں جو صرف عیاشی کے لیے کرپشن کرتے ہیں اگر ملازموں کو معقول تنخواہ دی جائے اور مفت طبی سہولتیں دی جائیں تو 90 فیصد سرکاری ملازم کرپشن سے توبہ کر سکتے ہیں۔

اس وقت بھی کرپشن کو تحفظ امریکہ، برطانیہ، سوئیزرلینڈ دے رہے ہیں۔ بلیک منی کا کھربوں روپہ، ڈالر، پاؤنڈ امریکہ، برطانیہ اور سوئیزرلینڈ کے بینکوں میں جمع ہے۔ مندرجہ بالا ممالک اگر بلیک منی کو تحفظ دینا بند کر دیں تو پوری دنیا سے کرپشن ختم ہو سکتی ہے، ظلم کی مزید بات یہ ہے کہ کھربوں ڈالر جو ان ممالک میں ترقی پذیر ممالک کے کرپٹ لوگوں کا جمع ہے یہی سرمایہ ترقی پذیر ممالک کو سود پر دے دیا جاتا ہے، اسی سرمایہ سے ترقی یافتہ ممالک خوشحال سے خوشحال تر ہو رہے ہیں جب کرپٹ ممالک کی فہرست شائع ہوتی ہے تو ان ممالک کا نام و نشان نہیں ہوتا ہے، ہمیشہ ترقی پذیر ممالک کو پہلی دس پوزیشن دے دی جاتی ہے۔

خامیوں کو دور کر کے اگر مندرجہ بالا تجاویز پر عمل کیا جائے تو کرپشن کسی حد تک کم ہو سکتی ہے کیونکہ

The system is first principal of life

این جی اوز سرمایہ کاری

این جی او کے الفاظ انگریزی زبان سے لیے گئے ہیں اس کو نان گورنمنٹ آرگنائزیشن کہتے ہیں(Non Government Orgnaization)یعنی غیر سرکاری فلاحی تنظیم، این جی اوز، سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ 1860ء کے تحت رجسٹرڈ ہوتی ہیں اس وقت پاکستان میں تقریباً 4500 این جی اوز رجسٹرڈ ہیں۔ جب ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں بادشاہت کے دور میں ایسی کوئی تنظیم نظر نہیں آتی جو لوگوں کی فلاح و بہبود کرتی تھی، صرف ایک افسانوی کردار حاتم طائی کا نظر آتا ہے، یہ غیر سرکاری تنظیمیں جمہوریت اور سرمایہ دارانہ نظام کے دور میں ہی شروع ہوئی ہیں، کچھ تنظیموں میں سرمایہ کاری تاجر اور صنعت کار کرتے ہیں اور کچھ تنظیموں میں سرمایہ کاری ترقی یافتہ ممالک کی حکومتیں کرتی ہیں اور اپنے مخصوص مقاصد حاصل کرتی ہیں، این جی اوز کی تین اقسام ہیں۔

1- مقامی این جی اوز
2- نیشنل این جی اوز
3- انٹرنیشنل این جی اوز

مقامی این جی اوز سے مراد وہ تنظیم ہے جس کی سرگرمیاں ایک شہر تک محدود ہوتی ہیں، مقامی تنظیمیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔

1- ایک شخصیت کے گرد گھومنے والی این جی او
2- برادری کی بنیاد پر بنی این جی او
3- مذہبی این جی او۔

پہلی قسم کی این جی او کیونکہ شخصیت کے گرد گھومتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ یہ شخصیت شہرت یافتہ ہو اور فیملی کے لحاظ سے مضبوط ہو، یہ شخصیت ساری زندگی ایک آمر کی

طرح اس کی سربراہ بنی رہتی ہے، یہ این جی او اپنا فنڈ امیر لوگوں سے ذاتی تعلقات کی بنیاد پر حاصل کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس این جی او کا سربراہ فنڈ دوستوں سے ماہانہ کمیٹی ڈال کر حاصل کرتا ہے، پہلی کمیٹی خود حاصل کر لیتا ہے دوسری کمیٹیاں ڈرا (قرعہ اندازی) کے ذریعے تقسیم کرتا ہے اس طریقہ سے اس شخصیت کا ذاتی خرچہ بھی چلتا رہتا ہے اور تنظیم بھی۔

دوسری قسم میں برادری کی سطح پر قائم کی گئی این جی او ہے یہ این جی او برادری کے نام پر اپنے برادری کے لوگوں سے ماہانہ چندہ وصول کرتی ہے اور اس چندہ سے برادری کا، ہسپتال وغیرہ بناتی ہے۔ یہ این جی او کی قسم عام طور پر چھوٹے شہروں میں پائی جاتی ہے کیونکہ وہاں برادری کی آمریت زیادہ مقدار میں پائی ہے، یہ تنظیم سیاسی لوگوں کے ذریعے گورنمنٹ سے بھی گرانٹ، زمین اور لون کی صورت میں حاصل کرتی ہے، برادری کے لوگوں کو ہی ملازم رکھتی ہے اور ان کے لیے ہی زیادہ تر کام کرتی ہے اور جب سیاست کا وقت آتا ہے تو برادری کے امیدوار کی ہی حمایت کرتی ہے اس طرح یہ تنظیم برادری آمریت کو فروغ دینے کا باعث بنتی ہے۔

تیسری قسم کی این جی او مذہبی ہے یہ عام طور پر فرقہ کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے اور ایک مخصوص فرقہ کے لوگوں سے فنڈ حاصل کرتی ہے، اسی فرقہ کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ فرقہ پرستی کو یہ این جی او فروغ دیتی ہے کیونکہ یہ فرقہ کی بنیاد پر ہی ادارے قائم کرتی ہے۔

مندرجہ بالا تینوں قسم کی مقامی این جی اوز ترقی کر کے نیشنل سطح پر پہنچ جاتی ہیں، ان تنظیموں کے سربراہ انکم ٹیکس کے محکمہ سے کافی حد تک بچے رہتے ہیں۔ ان این جی اوز میں کچھ اچھی اور کچھ بری این جی اوز ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ انٹرنیشنل این جی اوز سے اچھی ہیں کیونکہ عام طور پر یہ ملکی مفاد کے خلاف کام نہیں کرتی ہیں۔

اب میں انٹرنیشنل این جی اوز کی طرف آتا ہوں جن کا مقصد ترقی پذیر ممالک میں سیاسی، معاشی، ثقافتی کردار ادا کرنا ہے۔ ان این جی اوز کو مختلف ممالک اور مختلف کمپنیاں چلاتی ہیں اور اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں یہ کیسے اپنے مقاصد حاصل کرتی ہیں اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

ثقافتی لحاظ سے یہ انٹرنیشنل این جی اوز بھرپور کردار ادا کرتی ہیں، پچاس سال مسلمانوں کو ترقی یافتہ ممالک نے کمیونزم کے خلاف لڑایا اب یہ ترقی یافتہ ممالک کی این جی اوز ترقی پذیر ممالک کے مسلمانوں کو آزاد خیال بنانے کی کوشش کر رہی ہیں، یہ این جی اوز عورتوں کی آزادی کے لیے کوشاں ہیں اور سیکولر ازم کو فروغ دے رہی ہیں۔ سپین، روس، ترکی، بوسنیا اور براعظم افریقہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی ان این جی اوز نے وہاں سیکولر ازم کو پھیلایا، جہاں یہ سیکولر ازم نہ پھیلا سکیں وہاں انھوں نے جعلی مسلمانوں کو فروغ دیا جس میں احمدی، آغا خانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں ان انٹرنیشنل این جی اوز میں زیادہ تر وہ لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں جو لبرل ہیں یا دوسرے الفاظ میں مذہب سے آزاد ہیں یا اقلیتی ہیں۔ فیملی پلاننگ یعنی آبادی پر کنٹرول کے لیے بھی یہ این جی اوز کام کر رہی ہیں۔ عیسائی بشپ آف فیصل آباد کے اقدامِ خودکشی کو ان این جی اوز نے خوب اچھالا حالانکہ ہماری پاکستانی ایجنسیاں عیسائی بشپ آف فیصل آباد کے واقعہ کو قتل قرار دیتی ہیں جو کہ توہین رسالت ﷺ کے ملزم ایوب مسیح کیس میں فنڈ کی تقسیم کی وجہ سے ہوا، یہ فنڈ ترقی یافتہ ممالک نے ایوب مسیح کیس کے سلسلہ میں ڈالروں کی صورت میں دیا تھا۔

معاشی سطح پر یہ این جی اوز مختلف ترقی یافتہ ممالک اور مختلف انٹرنیشنل کمپنیوں کو سروے کر کے دیتی ہیں، وہ انھیں سروے کی بنیاد پر اپنی فیکٹریاں قائم کرتے ہیں اور مقامی صنعت کو ختم کر دیتے ہیں جیسے ہاتھ سے بنے ہوئے قالین پر انٹرنیشنل لیول پر کافی پراپیگنڈہ کیا گیا کہ پاکستان قالین بنانے میں چائلڈ لیبر سے کام لیتا ہے یہ بھی ایک این جی اوز کا کام تھا، اسی طرح سیالکوٹ کی فٹ بال کی صنعت کو کافی بدنام کیا گیا کہ یہاں چائلڈ لیبر کا مسئلہ ہے۔ ان این جی اوز نے ان ترقی پسندوں کو بھی ملازم رکھ لیا ہے جو کہ ترقی یافتہ ممالک کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتے تھے اور عوام کو انفارم کرتے تھے کہ کیسے ترقی یافتہ ممالک، ترقی پذیر ممالک کے وسائل کو اپنی طرف منتقل کر دیتے ہیں اب یہی لوگ ان انٹرنیشنل این جی اوز کے تنخواہ دار ہیں ان کے قصیدے کہتے ہیں۔

یہ انٹرنیشنل این جی اوز سیاسی طور پر بہت مضبوط کردار ادا کرتی ہیں، مختلف ترقی پذیر

ممالک میں یہ سیاسی شخصیات کو اپنے مختلف فنکشن پر دعوت دیتی ہیں اور ان کے لیے رائے عامہ ہموار کرتی ہیں، اس طرح ان کی سیاسی مدد ہو جاتی ہے لیکن ظاہری طور پر یہ سیاست میں دخل اندازی نہیں کرتیں۔ مختلف انفارمیشن رپورٹس بی بی سی اور سی این این کو بھیجتی ہیں کہ فلاں ملک میں ہیومن رائٹس کا خیال نہیں رکھا گیا، لوگوں سے زیادتی ہو رہی ہے، یہ این جی اوز ترقی یافتہ ممالک میں جو کچھ ایشیئن سے سلوک ہو رہا ہے وہ بیان نہیں کرتی، یہ صرف یہ رونا ہی روتی رہتی ہیں کی ترقی پذیر ممالک میں سیاسی آزادی نہیں، انصاف نہیں، یہ تمام ممالک کرپٹ ہیں۔

حکومتِ پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کو چاہئے کہ وہ ان این جی اوز کے فنڈ آڈٹ کریں جس طرح کہ پاکستان میں مختلف سرکاری محکموں کا ہوتا ہے اور اس کی رپورٹ پبلک اکاؤنٹ کمیٹی کو بھیجے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان این جی اوز نے کہاں سے فنڈ حاصل کیا، کہاں خرچ کیا اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے کیونکہ یہ انٹرنیشنل این جی اوز زیادہ تر عیسائی اور یہودی مقاصد کے لیے کام کر رہی ہیں۔ بے شک مقامی اور نیشنل این جی اوز کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے کیونکہ خود انحصاری کی بنیاد پر ہی ملک ترقی کرتے ہیں اور مضبوط بنتے ہیں۔

آبادی کا معاشی ترقی میں کردار

ٹامس مالتھس نے 1798ء میں ایک کتاب لکھی جس کا نام اصول آبادی (روٹی کھانے کی بہتات) رکھا اس کتاب میں مالتھس نے دو بنیادی مفروضے پیش کیے پہلا یہ کہ خوراک انسانی زندگی کی بقاء کے لیے ضروری ہے، دوسرا یہ کہ جنسی میلان ناگزیر ہے اُس وقت آبادی ایک ارب کے قریب تھی اس نے آبادی میں اضافہ کو ہر 25 سال بعد 1، 2، 4، 8، 16، 32، 64، 122، 244 کی نسبت سے پیش کیا اور خوراک کو 1، 2، 3، 4، 5، 6، 7، 8، 9 کی نسبت سے پیش کیا اور خوف زدہ کیا کہ مستقبل میں خوراک کم ہو جائے گی اور قحط پڑنے سے دنیا میں فسادات اور جنگیں شروع ہو جائیں گی اس لیے ضروری ہے کہ آبادی کو کنٹرول کیا جائے اب بھی سپر پاورز مسلمانوں کو خوف زدہ کر رہی ہیں کہ آبادی کو کم کریں اس کے لیے گرانٹ بھی دے رہی ہیں۔ مالتھس کے فارمولے کے مطابق اب آبادی 2 کھرب 44 ارب ہونی چاہئے تھی اور خوارک کی کمی کی وجہ سے دنیا تباہ و برباد ہونی چاہئے تھی لیکن ایسا نہیں ہوسکا ہے اس وقت پوری دنیا کی آبادی 6 ارب ہے بے شک آبادی کی زیادتی بھی نقصان دہ ہے۔ آبادی میں کیوں اضافہ نہیں ہوا قحط کیوں نہیں پڑا آبادی کو معاشی ترقی کے لیے یورپ اور امریکہ نے کیسے استعمال کیا آبادی کو ملٹی نیشنل کمپنیاں کیسے استعمال کر رہی ہیں آبادی کو چائنہ کیسے استعمال کر رہا ہے یہودیوں کی آبادی کیوں نہیں بڑھ سکی پاکستان اور مسلمان آبادی کو معاشی ترقی کے لیے کیسے استعمال کر سکتے ہیں یہ مضمون کا موضوع ہے۔

جب قومیں تہذیب کے درجے سے بلند ہوتی ہیں، بہتر تعلیم پاتی ہیں اور بود و باش کے بلند معیار اختیار کرتی ہیں تو شرح پیدائش کی رفتار میں خود بخود تخفیف کے انتظامات شروع کر دیتی ہیں، جن کی آبادی یا تو ایک خاص درجے پر پہنچ کر رُک گئیں یا ان میں کمی

آرہی ہے ان میں خاص طور پر قابل توجہ فرانس، سویڈن، آئس لینڈ، سنگاپور، آسٹریا، انگلستان اور آئرلینڈ ہیں۔ آبادی میں اضافہ اس لیے رُکا کہ اول قوتِ تولید گھٹ گئی، دوم نوجوانوں کی تعداد میں کمی آ گئی، سوم زندگی کا اوسط بڑھ گیا اور عیاش زندگی کا تصور برِاعظم یورپ اور برِاعظم امریکہ کے نوجوانوں میں آیا اس کے برعکس ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور انڈونیشیا کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا پھر بھی آبادی میں اضافہ مالتھس کے فارمولے کے مطابق نہ ہوسکا کیوں کہ پہلی جنگِ عظیم اور دوسری جنگِ عظیم میں لاکھوں انسان مارے گئے بعدازاں سپر پاورز کی سازش سے مسلمانوں کو جنگوں میں الجھا دیا گیا۔ عراق ایران جنگ میں 15 لاکھ مسلمان شہید ہوئے کھربوں روپیہ ضائع ہوا پھر عراق کویت جنگ میں بھی مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان ہوا۔ پاکستان اور ہندوستان کی جنگوں میں بھی لاکھوں انسان ہلاک ہوگئے ہیں۔ افغانستان اور روس کی جنگ میں بھی سپر پاورز نے مسلمانوں کی آبادی اور دولت کو استعمال کیا۔ اب بھی عالمِ اسلام کو مسئلہ کشمیر، چیچنیا، عراق، فلپائن، بوسنیا، فلسطین وغیرہ وغیرہ میں سپر پاورز نے الجھا رکھا ہے۔ اقوامِ متحدہ نے بھی کبھی امن کی تہہ دل سے کوشش نہیں کی ہے ان جنگوں کی وجہ سے بھی آبادی میں اضافہ کم ہوا ہے اور ان جنگوں کی وجہ سے ہی مسلمان معاشی ترقی کے منصوبے مکمل نہیں کرسکیں ہیں۔

انسانی دماغ وسائل پیدا کرتا ہے انسان نے موجودہ صدی میں بے شمار سائنسی تحقیقات کی ہیں۔ سائنس کی وجہ سے ہی بنجر زمینوں کو زرخیز کیا۔ سال میں فصل کی دو پیداوار حاصل کیں، فالتو زرعی پیداوار کو سٹور کرنے کا انتظام کیا، زرعی پیداوار کی امپورٹ اور ایکسپورٹ کو پروموٹ کیا، اسی طرح سائنس نے خوراک کی قلت نہ ہونے دی، پاکستان خاطرخواہ زرعی پیداوار میں اضافہ نہ کرسکا ہے، اس کی اہم وجہ جاگیردارانہ نظام ہے، پاکستان دنیا کے ان پہلے 5 ممالک میں شامل ہے جن کی بہت زیادہ زمین کاشت نہیں ہوتی ہے، جاگیردارانہ نظام ہی کی وجہ سے یہاں سائنسی علم عام نہیں ہوسکا ہے اور زمین کا صحیح استعمال نہیں ہوسکا ہے اور پاکستان اسی وجہ سے خوش حال نہیں ہوا ہے۔

یورپ نے انسانی وسائل سے خوب فائدہ اٹھایا، امریکہ دریافت کیا، آسٹریلیا

دریافت کیا، یہ سب کچھ انسانوں کی محنت کا ہی نتیجہ تھا۔ یورپ نے امریکہ اور آسٹریلیا کے قدرتی وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے انسانوں کی تجارت شروع کی تھی، یورپی اقوام برِاعظم افریقہ سے کثیر تعداد میں حبشی غلاموں کو امریکہ میں لے کر آئی، یورپی اقوام نے ان حبشیوں کو تمباکو کی کاشت میں استعمال کیا، اب بھی افریقی حبشی امریکہ میں خوش حال نہیں ہیں، اب بھی یورپ کے حکمران اپنی مرضی سے مخصوص لوگوں کو امپورٹ کرتے ہیں اور غیر صحت مند کاموں میں لگا دیتے ہیں جیسے ٹیکسی ڈرائیونگ، رنگ کرنا، پیٹرول پمپ پر کام کرنا، ڈش واشنگ وغیرہ وغیرہ اس طرح انھیں سستی لیبر بھی مہیا ہو جاتی ہے اور یورپین خود بھی صحت مند رہتے ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکہ سپر پاور کے طور پر ابھر، امریکہ اس وقت سے ترقی پذیر ممالک کے قدرتی وسائل اور انسانی وسائل سے اپنی حکمتِ عملی کی وجہ سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس نے اپنے ناکارہ فوجیوں اور ریٹائرڈ آدمیوں کو یورپ میں مختلف معاہدوں کے تحت بھیجا اور وہاں کے وسائل سے خوب فائدہ اٹھایا۔ امریکہ آبادی کے لحاظ سے اور رقبہ کے لحاظ سے کافی بڑا ملک ہے، یورپ کا کوئی ملک آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے، اب یورپ والوں نے متحد ہو کر امریکہ کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ یورو کرنسی کا آغاز، تجارت کا آغاز وغیرہ وغیرہ نتیجتاً امریکہ نے عراق کویت جنگ کے بہانے اپنی تمام ناکارہ فوج خلیج میں اتار دی، اب پورا خلیج امریکی فوجیوں کو بھتہ دے رہا ہے اسی جنگ میں اس نے اپنا تمام ناکارہ اسلحہ چلایا اور کھربوں ڈالر کا بل بنا دیا، امریکہ اپنی طاقت اور آبادی کا صحیح استعمال کر رہا ہے جبکہ مسلمان مختلف فرقوں اور گروہوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔

یورپ اور امریکہ اپنی آبادی کو مالیاتی اداروں اور انٹرنیشنل کمپنیوں میں بھرتی کرتا ہے مالیاتی ادارے جیسے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک وغیرہ وغیرہ ترقی پذیر ممالک میں داخل ہو جاتے ہیں وہاں مالیاتی اداروں کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کے اداروں میں شامل ہو جاتے ہیں وہاں ان کی نگرانی کرتے ہیں، امریکہ اور یورپ کے مفادات کا تحفظ کرتے

ہیں جیسے کہ آئی ایم ایف نے پاکستان سٹیٹ بینک اور سی بی آر میں اپنا مانیٹرنگ سیل قائم کر رکھا ہے، مختلف ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی پاکستان میں کام کر رہی ہیں، یہ کمپنیاں یورپ اور امریکہ سے باہر دوسرے ملکوں میں اس لیے نکلی، کیونکہ ترقی یافتہ ملکوں کے عوام کی قوتِ خرید جواب دینے لگی تھی اور ان کی پیداوار ضرورت سے زائد ہوگئی تھی اس زائد پیداوار کو دوسرے ممالک میں ایکسپورٹ کرنے میں ٹیکس، امپورٹ پالیسی، آمدورفت کے اخراجات اور دوسری مشکلات پیش آتی تھیں ان سے بچنے کے لیے ان کمپنیوں نے ایشیاء اور افریقہ کا رُخ کیا اور سستے داموں ان کی خدمات خریدی اور ترقی پذیر ممالک میں اپنی اشیاء فروخت کر کے خوب منافع کمار ہی ہیں۔

پچھلے ایک سو سال میں سب سے زیادہ سائنسدان یہودی پیدا ہوئے ہیں، سب سے زیادہ دولت یہودیوں کے پاس ہے لیکن پھر بھی وہ ایک چھوٹے سے ملک اسرائیل کے مالک ہیں اس کی اہم وجہ یہی ہے کہ یہودیوں کی آبادی بہت ہی کم ہے یہودی اندر داخل ہو کر جنگ کرتے ہیں، جیسے کہ عرب بادشاہوں کو انھوں نے اپنی عورتیں شادی کے بھیس میں جاسوسی کے لیے بھیجی ہوئی ہیں۔ یہودیوں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ اس لیے نہیں ہوسکتا کیونکہ یہودی پیدائشی یہودی ہوتا ہے غیر یہودی، یہودی مذہب اختیار نہیں کرسکتا ہے ۔یہودیوں نے اپنی طاقت میں اضافہ کے لیے عیسائی یہودی اتحاد کر رکھا ہے اس کے برعکس چائنہ کے پاس رقبہ اور آبادی معقول ہے لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے وہ امریکہ سے کمتر ہے پھر بھی چائنہ سپر پاور ہے دنیا کے ہر ملک میں آپ کو چائینہ کی اشیاء نظر آئیں گی حتیٰ کہ جاپان میں بھی چائنہ کی بہت سی مصنوعات سستے داموں مل جاتی ہیں۔ آبادی بہت بڑی طاقت ہے صرف اسے مناسب استعمال کرنے کی حکمتِ عملی ہونی چاہیے۔

کوئی بھی پیداواری عمل شروع کرنے کے لیے چار چیزوں کی ضرورت ہے یعنی زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم مسلمان ممالک میں یہ چاروں موجود ہیں، صرف اتحاد کی ضروت ہے۔ مسلمان ممالک میں پاکستان، انڈونیشیا، بنگلہ دیش آبادی کے لحاظ سے بڑے ملک ہیں باقی تقریباً تمام ممالک رقبہ کے لحاظ سے بڑے ہیں اور آبادی کم ہے جیسا کہ ایران، سعودی

عرب اور سوڈان وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت اسلامی دنیا کے کے پاس 80 فیصد ربر، 60 فیصد تیل، 40 فیصد گیس، 75 فیصد پٹ سن موجود ہے مگر باوجود وسائل کے مسلمان ان سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں کیونکہ ان کے پاس سائنسی علم اور معاشی علم کی کمی ہے، علاوہ ازیں عدم سیاسی استحکام ہے۔ پاکستان کے بارے میں بہت زیادہ پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ اس کی آبادی رقبہ کے لحاظ سے زیادہ ہے جبکہ یہ بات جاپان کے بارے میں نہیں کہی جاتی ہے کیونکہ وہ خوشحال ہے بے شک اس کی آبادی رقبہ کے لحاظ سے زیادہ ہے۔ جاپان کا رقبہ 377835 مربع کلومیٹر اور اس کی آبادی 13 کروڑ ہے، وہ دنیا کا خوشحال اور امیر ترین ملک ہے کیونکہ پچھلے پچاس سالوں سے اس نے کوئی جنگ نہیں لڑی ہے اس عرصہ میں اس نے سائنسدان پیدا کیے ہیں جن کی وجہ سے جاپان نے معاشی ترقی کی ہے، اس کے برعکس پاکستان کا رقبہ 803940 مربع کلومیٹر اور آبادی تقریباً 16 کروڑ ہے لیکن پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ مندرجہ بالا موازنہ سے صاف ظاہر ہے، جاپان کا رقبہ پاکستانی رقبہ سے 1/2 سے بھی کم ہے اور اس کی آبادی پاکستان کے قریب ترین ہے اگر اب بھی مڈل ایسٹ کے مسلمان ممالک پاکستان، مصر اور بنگلہ دیش کے ہنرمندوں کو اپنے ملک میں شہریت دیں جیسے کہ انڈر پالویشن ممالک کینیڈا، آسٹریلیا اور امریکہ دے رہے ہیں تو اسلامی ممالک عسکری حیثیت سے بھی مضبوط ہو گئے اور معاشی طور پر بھی طاقت ور ہوں گے اور اس ترقی کے اثرات انڈونیشیا، مصر، پاکستان اور بنگلہ دیش تک بھی پہنچیں گے۔ یورو کرنسی کی طرز پر مسلم ممالک مسلم کرنسی کا آغاز کریں، مسلم کرنسی میں تجارت کریں، آپس میں جنگ کی بجائے اسلامی بینک بنائیں اور اسلامی بینک میں رقم جمع کروائیں، آسان شرائط پر مسلمان ممالک کو قرضہ دیں، مشترکہ ریسرچ لیبارٹریز بنائیں جو نئی نئی سائنسی تحقیقات میں مدد کریں۔ اس وقت دنیا میں ترقی یافتہ ممالک جو جنگ لڑ رہے ہیں وہ سائنسی راز حاصل کرنے کی جنگ ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے معاشی ترقی ممکن ہے، مسلمانوں کو بھی سائنسی راز حاصل کرنے کا شعبہ قائم کرنا چاہئے۔ پاکستان کا ایک مخلص سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان پاکستان سے ایکسپورٹ ہوا بعد ازاں ایک سیاستدان حکمران نے اس کو

امپورٹ کرلیا،اس سائنسدان نے پاکستان کو ایٹمی قوت بنادیا ہے۔مختلف ایسے ہی مخلص سائنسدانوں کو ایکسپورٹ کرنے کی ضرورت ہے جو کہ ترقی یافتہ ممالک میں جائیں اور وہاں میٹل ٹیکنالوجی، کمپیوٹر ٹیکنالوجی، میڈیسن کے فارمولے اور مختلف سائنسی علوم کو پاکستان میں منتقل کریں۔مسلمانوں کے پاس زمین،محنت،سرمایہ اور تنظیم کی کمی نہیں ہے ،کمی ہے تو صرف سائنسی علوم کی، اس وقت دنیا کی آبادی 6 ارب ہے جبکہ مسلمانوں کی آبادی 1 ارب 25 کروڑ ہے،مسلمان ممالک اگر سائنسی علوم کو منصوبہ بندی سے ترقی یافتہ ممالک سے منتقل کرلیں اور آپس میں متحد ہوجائیں،سرحدوں کے تنازعے ختم کرلیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان بھی سپر پاور بن جائیں۔

ٹیکس کا معیشت میں کردار

ٹیکس سے مراد شہریوں کے ذمہ وہ واجب الادا رقم ہے جو حکومت کو ادا کی جاتی ہے اور حکومت اس کے بدلے میں شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دیتی ہے ٹیکس حکومت کی آمدنی کا اہم ذریعہ ہے اس آمدنی سے حکومت عام شہری کو سہولتیں فراہم کرتی ہے اور غیر ممالک سے حفاظت کے لیے فوج رکھتی ہے جیسا کہ پاکستان نے فوج رکھی ہوئی ہے ۔تمام ترقی یافتہ ممالک میں شہری ایمانداری سے ٹیکس ادا کرتے ہیں، ٹیکس کی دو اقسام ہیں ڈائریکٹ ٹیکس اور اِن ڈائریکٹ ٹیکس ۔ وفاقی ڈائریکٹ ٹیکس میں خاص طور پر اِنکم ٹیکس اور ویلتھ ٹیکس آتا ہے اور اِن ڈائریکٹ ٹیکس میں خاص طور پر کسٹم ڈیوٹی، سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس آتا ہے۔ پاکستان میں شہریوں کے ذمہ مندرجہ ذیل ٹیکس ہیں۔

وفاقی ٹیکس میں اِنکم ٹیکس، ویلتھ ٹیکس، بینک چک پر ٹیکس، سیلز ٹیکس، سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی، کسٹم ڈیوٹی، ایکسپورٹ ڈیوٹی، گیس اینڈ پٹرولیم سرچارج اور فارن ٹریول ٹیکس شامل ہیں۔ صوبائی ٹیکس میں لینڈ زریونیو، پراپرٹی ٹیکس، پراپرٹی ٹرانسفر ٹیکس، زرعی اِنکم ٹیکس، کیپٹل گین ٹیکس، سٹمپ ڈیوٹی، موٹر وہیکل ٹیکس، تفریح ٹیکس، صوبائی ایکسائز ڈیوٹی، لیبر ٹیکس، بجلی ٹیکس وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ میونسپل کمیٹی اور ڈسٹرکٹ کونسل بھی درج ذیل ٹیکس وصول کر رہی ہیں، جیسا کہ مارکیٹ لائسنس فیس، میلہ ٹیکس، واٹر سپلائی ٹیکس، ٹول ٹیکس، جانوروں کی خرید و فروخت پر ٹیکس، جانوروں کو ذبح کرنے پر ٹیکس، تہہ بازاری ٹیکس وغیرہ وغیرہ۔

حکومت نے ٹیکس لگاتے وقت کچھ اصولوں کو مدِ نظر رکھا ہے جو کہ یہ ہیں اصولِ مساوات، اصولِ تیقن، اصولِ سہولت، اصولِ کفایت، اصولِ پیداواری، اصولِ سادگی، اصولِ لچک، اصولِ تنوع وغیرہ وغیرہ۔ حکومت کے ٹیکس لگانے کے کچھ مقاصد ہیں مثلاً ٹیکس سے غیر مساوی تقسیم دولت کا خاتمہ، افراطِ زر میں کمی کرنا، سرکاری اخراجات کو ٹیکس وصول

کر کے پورا کرنا، ملکی آبادی کا مناسب استعمال اور اس کے لیے سہولتیں مہیا کرنا وغیرہ وغیرہ کیونکہ ٹیکس سے ہی پاکستانی معیشت چل رہی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں ٹیکس ادا کرنا غیرت کا مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور عوام کی اکثریت ایمانداری سے ٹیکس ادا کرتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں ٹیکس چوری کو ملک سے غداری اور بے غیرتی سمجھا جاتا ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک میں غیرت کا لفظ عام طور پر عورت کی عصمت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے کچھ لوگ اس وجہ سے ٹیکس چوری کرتے ہیں کہ ٹیکس کا صحیح استعمال نہیں ہوتا ہے، ٹیکس کی بچت ایک فن سمجھا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ حکومت ٹیکس کا صحیح استعمال کر رہی ہے اور ملکی معاشی ترقی کے لیے سنجیدہ ہے۔ پاکستان میں ٹیکس کی چوری میں کچھ علماء کا کردار بھی ہے، انھوں نے یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ زکوٰۃ ادا کرو، ٹیکس کی مذہب میں کوئی ہدایت نہیں ہے اسی وجہ سے بعض لوگوں پر مذہبی خوف نہیں ہے پاکستان میں ہر سال مئی یا جون کے مہینہ میں بجٹ آتا ہے اور نئے ٹیکس لاگو ہوتے ہیں اور کچھ پرانے ٹیکسوں کی شرح میں اضافہ ہو جاتا ہے بعض اشیاء پر رعایت بھی دی جاتی ہے، ان ٹیکسوں کی تشریح وقتاً بوقتاً سنٹرل بورڈ آف ریونیو اسلام آباد کرتا رہتا ہے۔ پاکستانی دانشوروں میں یہ بات مشہور ہے کہ ٹیکس آئی ایم ایف کی ہدایت پر لاگو ہوتے ہیں۔

ٹیکس کون ادا کرتا ہے صنعت کار کہتے ہیں کہ ہم ٹیکس ادا کرتے ہیں، تاجر کہتے ہیں کہ ہم ٹیکس ادا کرتے ہیں ہمیں سہولتیں دی جائیں حالانکہ ٹیکس ادا کرنے والا اصل طبقہ وہ ہے جس کی آمدنی فکس ہے اور وہ ٹیکس منتقل نہیں کر سکتا ہے یعنی لیبر، کسان، طالب علم، سرکاری ملازم اور پرائیویٹ ملازم وغیرہ وغیرہ صنعت کار اگر خام مال مہنگا خریدے گا تو وہ قیمت بڑھا دے گا اسی طرح اگر دکاندار کو اشیاء مہنگی ملیں گی تو وہ ان کی قیمت میں اضافہ کر دے گا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پاکستان کا ہر شہری ٹیکس ادا کر رہا ہے مثال کے طور پر اگر ایک عام شہری پیپسی / کوکا کولا کی بوتل پیتا ہے تو وہ سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی، سیلز ٹیکس، اِنکم ٹیکس جو اس کی قیمت میں شامل ہے اور کرتا ہے اسی طرح صابن، کپڑے، جوتے اور دوسری اشیاء جو کہ ایک عام شہری خریدتا ہے ٹیکس پیڈ ہوتی ہیں۔ حکومت 22 روپے لیٹر پیٹرول خرید کر 56 روپے لیٹر بیچ رہی ہے اس طرح وہ ہر شہری

سے ٹیکس وصول کر رہی ہے کیونکہ ہر شہری سفر کرتا ہے۔

اِنکم ٹیکس کا نفاذ سب سے پہلے چائنہ میں آج سے تقریباً 900 سال پہلے ہوا تھا اس کے بعد دوسرے ممالک میں بھی اِنکم ٹیکس کا نفاذ ہوا۔ اِنکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس سے تاجر کیوں خوفزدہ ہیں اس کی کچھ وجوہات ہیں۔ مثلاً یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ رائج الوقت اِنکم ٹیکس کے قوانین کے تحت ہر وہ شخص اِنکم ٹیکس ادا کرنے کا پابند ہے جس کی یومیہ آمدنی 274 روپے یعنی کہ 365 دن کی آمدنی 1 لاکھ روپے سے زیادہ ہو جبکہ یہ حقیقت ہے کہ 274 روپے کمانے والے آدمی کا خود کو پالنا مشکل ہے وہ پورا کنبہ کیسے پال سکتا ہے، وہ تو اس رقم سے نہ تو بچوں کو طبی سہولتیں اور نہ ہی تعلیمی سہولتیں فراہم کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ملک کے اندر 5 فیصد کے قریب طبقہ ہوگا، جو کہ ٹیکس کی پیچیدگیوں کو سمجھتا ہوگا یعنی ٹیکس ڈاکومنٹیشن کو سمجھ سکتا ہوگا، اکثریت کاروباری صرف لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اس کے علاوہ تاجروں کو یہ خوف ہے کہ ہر سال اِنکم ٹیکس میں اضافہ کرنا پڑے گا۔ افسروں کے صوابدیدی اختیارات سے بھی تاجر ڈرتے ہیں، بے شک اِنکم ٹیکس کی وصولی 70 فیصد امپورٹ کے وقت، بجلی کے بلوں سے، ٹیلی فون کے بلوں اور کرایہ کی ادائیگی یا خدمات فراہم کرنے کی ادائیگی پر اِنکم ٹیکس کی کٹوتی وغیرہ وغیرہ کر لی جاتی ہے۔ تاجر سیلز ٹیکس کے نفاذ سے بھی ڈرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں ان کو روزانہ سیل دکھانا پڑے گی اس طرح ان کی صحیح سیل ظاہر ہو جائے گی اور اس پر اِنکم ٹیکس بھی صحیح ادا کرنا پڑے گا۔

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ تاجر سیلز ٹیکس انسپکٹر سے خوف زدہ ہے اور اس انسپکٹر کی تنخواہ 6 ہزار روپے سے شروع ہو کر 10 ہزار تک ہے اس کے علاوہ اسے کوئی سہولت نہیں ہے یعنی کہ صحت، تعلیم اور رہائش وغیرہ وغیرہ۔ بے شک اس کے پاس اختیارات بہت ہیں، ٹیکس کے نظام میں اگر درج ذیل اصلاحات کر دی جائیں تو امید ہے کہ تاجروں کا خوف دور ہو جائے گا اور وہ ایمانداری سے ٹیکس دینا شروع کر دیں گے کیونکہ ٹیکس کہ بغیر پاکستانی معیشت نہیں چل سکتی ہے۔

1- سیلز ٹیکس اور اِنکم ٹیکس کے سرکاری کاغذات کو اردو میں تحریر کیا جائے۔

2- اِنکم ٹیکس چھوٹ کی حد ایک لاکھ سے بڑھا کر دو لاکھ روپے کر دی جائے۔

3- حکومت ہر مہینے آمدنی اور اخراجات کی تفصیل ٹی وی اور انٹرنیٹ پر شائع کرے تاکہ عوام کو معلوم ہو سکے کہ ان کی ٹیکس کی رقم صحیح جگہ پر صرف ہوئی ہے۔

4- علماء کو ایجوکیٹ کیا جائے کہ ٹیکس ملک کی سلامتی اور عوام کی خوشحالی کے لیے ضروری ہے، اس کے بغیر کوئی ملک معاشی ترقی نہیں کر سکتا ہے اور پوری دنیا میں ٹیکس کا نفاذ اسی مقصد کے لیے کیا گیا ہے۔

5- ٹیکس کے عملہ کی تنخواہیں معقول کی جائیں تا کہ وہ کرپشن نہ کریں اس کے لیے معقول تجویز یہ ہے کہ ٹیکس کے محکموں کو مالیاتی ادارے ڈکلیئر کر دیا جائے ان کے سپاہی کی تنخواہ بینک گارڈ کے مطابق اور ان کے کلرک کی تنخواہ بینک کلرک کی تنخواہ کے مطابق اور ان کے انسپکٹر کی تنخواہ بینک آفیسر کے مطابق کر دی جائے اور اسی طرح سینئر افسروں کی تنخواہیں بھی بڑھا دی جائیں تو کوئی بات نہیں کہ کرپشن ختم نہ ہو۔ بینک ملازمین کی طرح ٹیکس ملازمین کو بھی لون کی سہولت، طبی سہولت، تعلیمی سہولت وغیرہ دی جائے اس طرح 90 فیصد کرپشن ختم ہو جائے گی کیونکہ صرف 10 فیصد ٹیکس آفیسر عیاشی کے لیے کرپشن کرتے ہیں باقی اگر کوئی کرپشن کرتا ہے تو صرف بنیادی اور آسائشی ضروریات پوری کرنے کے لیے بے شک ٹیکس انسپکٹر کی تنخواہ میں اضافہ سے حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ اِنکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس کی چوری نہیں ہوگی، سمگلنگ کا خاتمہ ہوگا، تاجروں اور ٹیکس انسپکٹروں کے درمیان خوشگوار ماحول بنے گا۔

6- ٹیکس ایمنسٹی سکیم کو سارا سال جاری رکھا جائے جب بھی تاجر کو اپنی غلطی کا احساس ہو تو وہ اس سے فائدہ اُٹھائے، اس سکیم کو اگر ایک مدت کے بعد بند کر دیا گیا تو منی لانڈرنگ میں فارن کرنسی ایکسچینجر مرکزی کردار ادا کریں گے اور ان کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ جبکہ حکومت کو کوئی خاص مالی فائدہ نہیں ہوگا بے شک ٹیکسوں کی زیادتی میں نقصان دہ ہے اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ زیادہ ٹیکس نافذ ہونے کی بنیاد پر سرمایہ دار لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں ہجرت کر گئے۔ برِصغیر میں سب سے بڑی مثال رنجیت سنگھ کے دور کی ہے، رنجیت سنگھ نے کشمیر میں اتنے زیادہ ٹیکس لگا دیئے کہ وہاں سے 6 لاکھ افراد ہجرت کر کے پنجاب میں بس گئے۔ ٹیکسوں کا بوجھ ایک حد تک ہونا چاہئے تا کہ عوام آسانی سے برداشت کر سکیں کیونکہ ترقی پذیر ممالک میں برین ڈرین کا مسئلہ پہلے سے ہی موجود ہے۔ بے شک ٹیکس دینا بہت ضروری ہے اور اسی ٹیکس سے ملک کی معیشت وابستہ ہے۔

پاکستان میں انڈسٹریل کلچر کیوں پیدا نہ ہوسکا؟

دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک کی معاشی ترقی میں اہم کردار سائنسی علوم کا ہے۔ سائنس نے ہی انڈسٹریل کلچر کی بنیاد رکھی۔ انڈسٹریل کلچر نہ پیدا کرنے کی وجہ سے ہی مسلمان ممالک کو ترقی یافتہ ممالک نہیں کہا جاتا وگرنہ مسلمان ممالک کے پاس وسائل کی کمی نہیں۔ مسلمانوں کے پچاس سے زیادہ ممالک ہیں لیکن کسی ایک کو بھی ویٹو پار کا حق نہیں ہے۔ پاکستان کو بھی ورثہ میں انڈسٹریل کلچر نہیں ملا ہے۔ اکبر کے دورِ حکومت میں یورپ نے پرنٹنگ پریس ایجاد کیا اور مغلوں کو پرنٹنگ پریس خریدنے کے لیے مشورہ دیا، لیکن اس وقت کے نورتنوں نے یہ تجویز رَد کردی اکبر بادشاہ کو بتایا کہ پرنٹنگ پریس سے جو کتابیں چھپ کر آئیں گی وہ خوشخط نہیں ہوں گی جو کتاب ہم ہاتھ سے لکھتے ہیں وہ خوشخط ہوتی ہے ۔اُس وقت کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں اور صرف حکمرانوں کی لائبریریوں میں موجود ہوتی تھیں، عام آدمی اِن کتابوں سے فیض یاب نہیں ہوسکتا تھا، لہٰذا علم عام نہ ہوسکا، کمپیوٹر علمی ترقی کی بنیاد پر ہی وجود میں آیا۔ پاکستان میں انڈسٹریل کلچر کیوں پیدا نہ ہوسکا اور اسے کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے اس تفصیل کچھ یوں ہے۔

انگریز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے کیونکہ یورپ میں مصالحہ جات، سوتی کپڑا، ریشمی کپڑا، نیل، چینی کے برتن، درد دور کرنے کے لیے افیون سے بنی ادویات نہیں تھیں۔ انگریزوں نے جدید عسکری تربیت مکاری اور جدید اسلحہ کی بنیاد پر مغلوں اور دوسرے حکمرانوں پر فتح حاصل کی انھوں نے اپنے دور میں یہاں پر فنی تعلیم کے ادارے نہ کھولے اور نہ ہی یہاں پر جدید لیبارٹریز بننے دیں کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہاں انڈسٹریل کلچر پیدا ہوگیا تو ہندوستانی لوگوں کا سوچنے کا انداز بھی سائنٹیفک ہوجائے گا اور یہاں جدید اسلحہ کی فیکٹریاں لگ جائیں گی اور ہمارا دیس نکالا ہوجائے گا۔ آج بھی ترقی یافتہ ممالک

نہیں چاہتے کہ کسی بھی مسلم ملک میں جدید اسلحہ کی فیکٹریاں لگیں انھوں نے ورثہ میں صرف جنرل ایجوکیشن کے ادارے دیئے۔

جواہر لال نہرو نے ہندوستان کی حکومت سنبھالنے کے بعد ایک رپورٹ تیار کروائی جس میں اس نے دانشوروں سے یہ تحقیق کروائی کیوں غیر ہندوستان لوگ ہندوستان میں کامیاب ہوئے۔اس رپورٹ کو نہرو رپورٹ کہا گیا اس میں تحقیق کرنے والوں نے بتایا کہ سب سے بڑی خرابی ہندوستان کا جاگیردارنہ نظام ہے۔ایک جاگیردار کی ہمیشہ یہ سوچ ہوتی ہے کہ اس کے مزارع ہمیشہ اَن پڑھ رہیں اور اپنے حقوق وفرائض کے بارے میں نہ جان سکیں ،لیکن اس کے برعکس صنعت کار کو مزدوروں، انجینئروں، ڈاکٹروں اور اکاؤنٹینٹ کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان کے بغیر کوئی بھی صنعت ترقی نہیں کرسکتی یعنی اس کی سوچ اور جاگیردار کی سوچ میں بہت فرق ہے۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ صنعت کار کا مقصد بھی منافع کمانا ہوتا ہے۔نہرو رپورٹ کے بعد ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام ختم کردیا گیا لیکن پاکستان میں اب بھی جاگیردارانہ نظام موجود ہے اس کی وجہ سے یہاں انڈسٹریل کلچر نہیں پیدا ہوسکا ضرورت ہے کہ جاگیردارانہ نظام کو ختم کیا جائے۔

انڈسٹری کی ترقی کا گولڈن پیریڈ 1958ء تا 1968ء ہے اس دور میں صنعت کو بہت ترقی ہوئی۔اس دور میں بونس ووچر یا ایکسپورٹ بونس سکیم شروع کی گئی اور ایکسپورٹ کو حوصلہ افزائی ہوئی مشینری کی امپورٹ اور ٹرانسپورٹ آلات کی امپورٹ میں خصوصی رعایت دی گئی اس دور میں باقاعدہ جال پھیلایا گیا آسان شرائط پر صنعت کاروں کو قرضے دیئے گئے۔ 1972ء تا 1977ء کا پیریڈ انڈسٹری کے زوال کا پیریڈ ہے، اس دور میں دس (10) بنیادی صنعتوں کو نیشنلائزڈ کردیا گیا۔جو درج ذیل ہیں:

1- آئرن اینڈ سٹیل

2- بنیادی میٹل

3- ہیوی انجینئرنگ

4- موٹر وہیکل انجینئرنگ

5- ٹریکٹر مینوفیکچرنگ اینڈ اسمبلینگ

6- کیمیکل انڈسٹری

7- پیٹرو کیمیکل انڈسٹری

8- سیمنٹ

9- پبلک یوٹیلیٹی سروسز

10- رائس ملز اور فلور ملز وغیرہ

نیشنلائزیشن سے مایوس ہوکر سرمایہ داروں نے صنعت سے سرمایہ کاری کھینچ لی اور غیر پیداواری سرمایہ کاری شروع کردی۔ 131 فیصد روپے کی ڈی ویلیوایشن نے بھی صنعت پر منفی اثرات مرتب کیے بے شک اس دور میں مصنوعی ترقی بھی ہوئی، پاسپورٹ فری کردیا گیا جس کی وجہ سے لیبر غیر ممالک میں گئی اور کافی زرِ مبادلہ ملک کے اندر آیا۔ صنعت کاروں کے علاوہ عام آدمی بھی خوشحال ہوا تعلیمی اصلاحات ہوئی، سٹوڈنٹ کو ٹرانسپورٹ کی رعایت دی گئی، لیبر قوانین کا نفاذ ہوا، خوشحالی عام آدمی تک پہنچی کیونکہ انفرادی ترقی اس دور میں ہوئی، قومی پیداروار میں اضافہ نہ ہوا۔ بے شک انڈسٹریل کلچر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسی اشیاء کی امپورٹ پر پابندی کردی جائے جو کہ ملک کے اندر تیار ہوتی ہیں اور ایسی اشیاء پر بھی پابندی عائد کردی جائے جو عیاشی کے زمرے میں آتی ہیں، علاوہ اَزیں مقامی صنعت کو ٹیکس میں بھی رعایت دی جائے۔

Brain Generate Resources انسانی دماغ وسائل پیدا کرتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام بغیر لباس کے دنیا میں تشریف لائے دنیا میں تمام ایجادات انسانی دماغ ہی کی بنیاد پر ہوئی ہیں۔ امریکہ کی کمپیوٹر صنعت کی آمدنی پاکستان کے سالانہ بجٹ سے زیادہ ہے۔ پاکستان میں فنی ادارے نہ ہونے کے برابر ہیں، غیر ممالک میں جو صنعتی اشیاء بنتی ہیں پاکستان میں مستری اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہیں کبھی کامیاب ہوجاتے ہیں اور کبھی ناکام۔ فنی ادارے انفراسٹرکچر پیدا کرتے ہیں۔ اگر ہر ڈویژن میں وہاں کی پیداوار اور صنعت کے مطابق وہاں فنی ادارے بنادیئے جائیں تو وہاں کی انڈسٹری

لازمی ترقی کرتی ہے ضرورت ہے کہ جنرل ایجوکیشن کے ساتھ ساتھ فنی تعلیم کو فروغ دیا جائے اور ہر ڈویژن میں لیبارٹری قائم کی جائے۔

ملٹی نیشنل کمپنیوں نے خالص پاکستانی انڈسٹری کو ترقی نہیں کرنے دی، ابھی تک پاکستانی صنعت کار مشروبات، سگریٹ، کپڑے مار ادویات، آئل، اسلحہ سازی، کاسمٹیک، میٹل اور کیمیکل میں نام نہیں پیدا کر سکے کیونکہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ یہ بڑی کمپنیاں جس ملک میں بھی جاتی ہیں وہاں کے وسائل سے سرمایہ کی طاقت پر بھرپور فائدہ اٹھاتی ہیں اور منافع سے کسی دوسرے ملک میں انڈسٹری لگاتی ہیں۔ پاکستانی صرف تنخواہ پر خوش ہو جاتے ہیں ،انھوں نے پاکستان میں رہ کر پاکستانی سرمایہ دار کی چھوٹی انڈسٹری کو مقابلہ پر وسائل کی طاقت پر آنے نہیں دیا مثال کے طور پر امپورٹڈ ٹن پیکنگ پیپسی 40 روپے کی بوتل ہے جبکہ پاکستان میں بنی پیپسی 10 روپے میں فروخت ہو رہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی تنخواہ دو ہزار روپے ہے جبکہ امریکہ میں دو ہزار ڈالر ہے۔ اس طرح پانی، بجلی، پیٹرول اور ٹیکس کی ادائیگی روپوں میں کی جاتی ہے اگر یہ امریکہ میں ہوں تو یہ تمام ادائیگیاں ڈالروں میں کی جائیں گی، یہی وجہ ہے کہ پاکستانی انڈسٹری ملٹی نیشنل کمپنیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ پاکستان میں انڈسٹریل کلچر پیدا کرنے کے لیے سمال اینڈ کاٹیج انڈسٹری کو فروغ دیا جائے اور بڑی پاکستانی کمپنیوں کو بھی ٹیکس میں سہولت دی جائے۔

پاکستان جب وجود میں آیا تو اس وقت اس کی 83 فیصد آبادی دیہی اور 17 فیصد شہری تھی۔ جاگیرداری پاکستان کے ہر شعبے میں تھے اس وجہ سے پاکستان کو ایک زرعی ملک قرار دے دیا گیا، حالانکہ پاکستان آج تک اپنی زرعی زمین سے فائدہ نہیں اُٹھا سکا اور نہ ہی اب تک زرعی انڈسٹریل کلچر پیدا کر سکا۔ ٹریکٹر، کیڑے مار ادویات، بیج اور زرعی آلات وغیرہ پاکستان کو غیر ممالک سے خریدنے پڑتے ہیں جس کی وجہ سے زرعی پیداوار مہنگی ہو جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ زرعی انجینئرنگ کو فروغ دیا جائے ، ملک کے اندر زرعی ادویات، آلات اور بیج تیار کیا جائے ، فالتو زرعی پیداوار کو ایکسپورٹ کرنے والے فریٹ میں انڈیا کی طرح رعایت دیں۔ اس طرح زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگا، زرعی انڈسٹری کو

فروغ ہوگا، جس طرح کہ نیسلے (Nestle) کمپنی پاکستانی پیداوار سے فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ منرل واٹر بنا کر، جوس بنا کر اور بچوں کی میڈی کیٹڈ خوراک بنا کر، ایسی ہی خالص پاکستانی زرعی انڈسٹری بنانے کی ضرورت ہے۔

امپورٹ اور ایکسپورٹ پالیسی کی وجہ سے بھی پاکستان میں انڈسٹریل کلچر کو نقصان پہنچا ہے۔ پاکستان کا توازن ادائیگی اب بھی بہتر نہیں ہے، یعنی ویلیو کے لحاظ سے ہماری امپورٹ، ایکسپورٹ کی نسبت زیادہ ہے۔ اندرونِ ملک ٹیکس زیادہ ہے نسبتاً امپورٹ ٹیکس، سمگلنگ مزید حوصلہ شکنی کرتی ہے۔ پاکستانی صنعت کی ضرورت ہے کہ پاکستانی انڈسٹری کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جائیں سمگلنگ کا خاتمہ کیا جائے اور پاکستانی مصنوعات کی فری تشہیر کی جائے تب ہی پاکستانی انڈسٹری، انڈسٹریل کلچر کا فروغ ممکن ہے۔

ٹیکس کے پیچیدہ نظام کی وجہ سے سرمایہ دار اپنے سرمایہ کو غیر پیداواری کاروبار میں لگا رہے ہیں کیونکہ غیر پیداواری کاروبار میں منافع زیادہ ہے اور اس میں سرمایہ زیادہ محفوظ حالت میں ہے۔ غیر پیداواری کاروبار جو بہت عروج پر ہیں ان میں فارن کرنسی بزنس اور گولڈ بزنس ہیں یہ دونوں امپورٹڈ آئٹم ہیں اس طرح سٹاک ایکسچینج کا بزنس بھی ملکی ترقی میں مثبت کردار ادا نہیں کر رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ دونوں امپورٹڈ بزنس ختم کیے جائیں کیونکہ دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں یہ غیر پیداواری بزنس نہیں ہیں۔ انڈسٹریلسٹ کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جائیں اور اسے پابند کیا جائے کہ وہ اپنا منافع ایک حد سے نہ بڑھائے۔

یوٹیلیٹی سروسز جیسے کہ آئل، بجلی، گیس، پانی، ٹیلی فون پاکستان میں دوسرے ممالک کی نسبت بہت زیادہ مہنگے ہیں۔ ان میں زیادہ تر یوٹیلیٹی سروسز پر بیرونی کمپنیوں کا کنٹرول ہے اور ان کے ریٹ ہر سال بڑھاتے رہتے ہیں، اس طرح انڈسٹریل گڈز مہنگی ہو جاتی ہیں نسبتاً غیر ملکی اشیاء کے۔ ضرورت ہے کہ ان کی قیمتوں کو کنٹرول کیا جائے اور قیمتیں کم اَز کم کی جائیں اور اس انڈسٹری کو پاکستانی انڈسٹری میں تبدیل کیا جائے تا کہ انڈسٹریل اخراجات کم اَز کم ہو جائیں، ساتھ ساتھ غیر مساوی تقسیم دولت کا خاتمہ کیا جائے تا کہ ملک کے اندر حسد اور نفرت کی فضا پیدا نہ ہو۔

بینک لوگوں سے فالتو امانتیں وصول کرتا ہے اور ضرورت مندوں کو امانتیں سود لے کر قرض

پر دیتا ہے۔ پاکستان کو بنے 59 سال ہو گئے ابھی تک پاکستانی بینکوں پر لوگوں کا اعتبار نہیں ہے جو کہ غیر ملکی بینکوں پر ہے۔ کبھی فنانس کارپوریشن کمپنیاں اکاؤنٹ ہولڈروں کے ساتھ فراڈ کر جاتی ہیں اور کبھی حکومت کی پالیسی ایسی سامنے آتی ہے جس سے پاکستانی بینکوں کی ساکھ کو نقصان پہنچتا ہے، کبھی راتوں رات زکوٰۃ کاٹنے کا اعلان ہو جاتا ہے اور کبھی فارن کرنسی منجمد ہو جاتی ہے اور کبھی کسی شخص کو کرپٹ قرار دے کر اس کے اکاؤنٹس اور لاکرز سیل کر دیئے جاتے ہیں۔ ان سب پالیسیوں کا نقصان پاکستانی بینکوں کو ہوتا ہے، ہر سرمایہ دار کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کا سرمایہ بیرونی ملکوں کے بینکوں میں رہے وہاں کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا ہے، وہاں سرمایہ دار سمجھتے ہیں کہ وہاں ان کا سرمایہ زیادہ محفوظ حالت میں ہے۔ یہی سرمایہ آئی ایم ایف پاکستان کو قرضہ کی صورت میں دیتا ہے اور کڑی شرائط نافذ کر دیتا ہے جس سے ملکی معیشت جام ہو جاتی ہے ۔ یہ سب غیر ملکی بینک ان ممالک کے ہیں جو انسانی حقوق کے چمپئن ہیں اور یہ ممالک ہی آئی ایم ایف کے انچارج ہیں۔ اگر بینک سرمایہ دار کو سرمایے کا تحفظ دیں تو کوئی ایسی بات نہیں کہ پاکستان معاشی ترقی کر جائے اور انڈسٹریل کلچر پیدا نہ ہو۔

پاکستان کے اکثر پالیسی میکر پی ایچ ڈی نہیں ہیں مثلاً سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کا سیاستدان وزیر پیٹرول اور سائنس کے بارے میں نہیں جانتا اسی طرح سی ایس پی سیکرٹری بھی اس فیلڈ کا ماہر نہیں ہوتا نتیجتاً پالیسی اچھی نہیں بنتی۔ امریکہ اور ملائیشیا نے اگر ترقی کی ہے تو وہاں ہر شعبہ میں اس فیلڈ کا پالیسی میکر شعبہ کا پی ایچ ڈی ہے، وہاں سی ایس پی کلچر اور اَن پڑھ سیاستدان کلچر نہیں ہے۔ ضرورت ہے تھینک ٹینک کا قیام عمل میں لایا جائے جو ملکی وسائل پر سوچیں اور ان مسائل کا حل پیش کریں، ضروری ہے کی تھینک ٹینک آئی ایم ایف یا دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے ملازمین نہ ہوں کیونکہ وہ ان بیرونی اداروں سے مخلص ہوں گے پاکستان سے نہیں۔

تمام مذاہب کا بانی ایشیاء ہے، کنفیوشش، بدھ مت، جین مت، ہندو، عیسائی، یہودی اور اسلام یہ تمام مذاہب ایشیاء میں ہی پیدا ہوئے لیکن اب ایشیاء زوال کا شکار ہے کیونکہ یہاں سے دانشور امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں ایکسپورٹ ہو رہے ہیں اور یہ سب کچھ اچھی منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے ہو رہا ہے وگرنہ یہاں

قابل لوگوں کی کمی نہیں، پاکستانی عوام ثقافت و ہنرمند آدمی کی وہ قدر نہیں کرتی ہے جو کہ یہاں ٹیبل ورک کرنے والوں کی ہے۔ ذات پات کا نظام بھی سوشل سیٹ اَپ کو ڈسٹرب کررہا ہے، ضرورت ہے کہ اب یہاں ایسا کلچر پیدا کیا جائے جس میں اچھے دماغ رکھنے والے کی قدر کی جائے، اُسے لون دیا جائے تا کہ وہ اپنی صنعت پاکستان میں لگا سکے۔ کریڈٹ کلچر بھی صنعتی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اگر کوئی محبِ وطن اور ذہین پاکستانی، پاکستان میں صنعت لگاتا ہے تو اسے دکاندار، ڈسٹری بیوٹر ادھار پر اس کی اشیاء لے کر رقم واپس نہیں کرتے، ادھار لے کر رقم واپس نہ کرنے کے پاکستان میں بہت سارے واقعات ہیں۔ بہت سے صنعت کار اس وجہ سے تباہ ہوگئے ہیں، پاکستان میں کریڈٹ کو قانونی تحفظ دینے کی ضرورت ہے۔ جو بھی دکاندار، ڈسٹری بیوٹر، صنعت کار سے فراڈ کرے اسے کڑی سے کڑی سزا دی جائے جیسا کہ ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے۔

بے شک پاکستان میں وسائل کی کمی نہیں ہے صرف اچھے نظام اور اچھی منصوبہ بندی کی کمی ہے، یہاں اکثریت اچھے لوگوں کی ہے اگر یہاں جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ، فنی اداروں کا قیام، ذہین لوگوں کی قدر، چھوٹی صنعت کو تحفظ، امپورٹ اور ایکسپورٹ کے نظام میں اصلاحات، سمگلنگ کی حوصلہ شکنی، بینک کے اکاؤنٹ ہولڈر کے سرمائے کو تحفظ، مثبت کریڈٹ کلچر، تھینک ٹینک کا قیام کردیا جائے تو کوئی ایسی بات نہیں کہ پاکستان میں انڈسٹریل کلچر کو فروغ حاصل نہ ہو اور پاکستان ایک ترقی یافتہ ملک بن جائے۔ موجودہ حکومت سے قوی امید ہے کہ یہ پاکستان میں انڈسٹریل کلچر ضرور پیدا کرے گی۔

سمگلنگ ایک معاشی ناسور

سمگلنگ کا آغاز اس دن شروع ہوگیا تھا جس دن سے بین الاقوامی تجارت کا آغاز ہوا۔ ترقی یافتہ ممالک میں یہ معاشی بیماری بہت ہی معمولی مقدار میں ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک میں سمگلنگ عام ہے۔ سمگلنگ سے مراد ٹیکس سے بچنے کے لیے غیر قانونی امپورٹ ایکسپورٹ کرنا ہے اس کے لیے قانونی راستے اور غیر قانونی راستے دونوں اپنائے جاتے ہیں۔

لارڈ کینز نے کلی معاشیات کی تھیوری پیش کی اس کلی معاشیات میں اس نے ''زائد پیداوار'' کے تصور کو زیر بحث لایا اور ترقی یافتہ ممالک کو سمجھایا کہ اگر زائد پیداوار کو ترقی پذیر ممالک فروخت نہیں کر سکیں گے تو ان کی معاشی ترقی ختم ہو جائے گی، مثال کے طور پر سوئیزر لینڈ گھڑیاں بنانے والا ملک ہے اس کے اپنے ملک کے اندر ایک سال میں گھڑیوں کی فروخت پانچ لاکھ ہے، سوئیزر لینڈ اگر دس لاکھ گھڑیاں بنالیتا ہے اور گھڑیاں ایکسپورٹ نہیں ہو پاتی، ایک گھڑی کی قیمت 1000 روپیہ ہے، گھڑی کی قیمت 1000 روپیہ سے کم کر کے 700 روپے مقرر کر دی جاتی ہے تاکہ فرم کی تمام گھڑیاں فروخت ہو جائیں اور فرم کو نقصان نہ اُٹھانا پڑے، صارفین سستی گھڑی ہونے کی وجہ سے پانچ لاکھ گھڑیاں خریدنے کی بجائے 6 لاکھ گھڑیاں خرید لیتے ہیں پھر بھی چار لاکھ گھڑیاں بچ جائیں گی اس طرح فرم کو نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ فرم کچھ ورکروں کو نوکری سے نکال دے گی اور کچھ ورکروں کو سستی تنخواہ پر رکھ لے گی ملک میں بیروزگاری پھیلے گی، صارفین کی قوتِ خرید کم ہو جائے گی، قوتِ خرید میں کمی آنے کی وجہ سے شیطانی معاشی چکر کا آغاز ہو جائے گا اور معاشی ترقی کا عمل رُک جائے گا مثال کے طور پر زائد پیداوار کو فروخت نہ کر سکنے کی وجہ سے سیمی روس کو معاشی نقصان اٹھانا پڑا ہے یعنی زائد پیداوار کو ایکسپورٹ کرنے میں ان کی معاشی ترقی کا راز بھی ہے۔ ایران، سوڈان اور لیبیا پر جو ترقی یافتہ ممالک نے تجارتی پابندیاں لگا رکھی ہیں اس کا

مقصد بھی یہی ہے کہ یہ ممالک اپنی زائد پیداوار کو ضرورت مند ممالک میں ایکسپورٹ نہ کرسکیں اور بیروزگاری کا شکار ہوجائیں۔اس لیے جب زائد پیداوار قانونی طریقہ سے ایکسپورٹ نہیں ہوتی تو ترقی یافتہ ممالک سمگلروں سے رابطے قائم کر کے اپنی زائد پیداوار کو فروخت کردیتے ہیں۔ایشیاء میں دبئی پورٹ اور سنگاپور پورٹ ٹیکس فری پورٹ ہیں، یہاں ترقی یافتہ ممالک اپنی فالتو اشیاء بھیج دیتے ہیں پھر یہی فالتو اشیاء منظم طریقہ سے سمگل ہوجاتی ہیں اور صارفین کو سستے داموں مل جاتی ہیں۔

سمگلنگ کی دو اقسام ہیں پہلی قسم میں غیر قانونی راستے اپنا کر سمگلنگ کی جاتی ہے جیسے دبئی لانچوں کے ذریعے، دوسری قسم میں قانونی راستوں سے سمگلنگ کی جاتی ہے، امپورٹ اور ایکسپورٹ باقاعدہ ڈاکومنٹس کے ذریعے کی جاتی ہے اسے ٹیبل سمگلنگ بھی کہا جاسکتا ہے اس میں انڈر انوائی سنگ (Under Invoicing) اور اوور انوا سنگ (Over Invoicing) کسٹم ٹیرف ہیڈنگ تبدیل کرنا، ڈسکرپشن تبدیل کرنا، مقدار کم کرنا، مقدار زیادہ کرنا جیسے طریقے اپنائے جاتے ہیں۔سمگلنگ کسٹم ایکٹ 1969ء کے تحت ایک جرم ہے پاکستان میں سمگلنگ کیسے ہورہی ہے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

پاک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ ایگریمنٹ 1965ء کے تحت افغانستان کو کراچی کی بندرگاہ سے امپورٹ اور ایکسپورٹ کی سہولت دی گئی ہے جو کہ اب تک جاری ہے۔افغانی تاجر اور حکمران کراچی کے راستہ سے مختلف اشیاء امپورٹ کرلیتے ہیں پھر یہی اشیاء غیر قانونی راستہ سے پاکستان میں سمگل ہوجاتی ہیں۔اس طریقہ کار سے پاکستان کو اربوں روپے کے ٹیکس کا نقصان ہورہا ہے۔افغان، روس جنگ کے دوران افغانستان کے تاجروں اور حکمرانوں نے پاک افغان ٹریڈ ایگریمنٹ سے خوب فائدہ اٹھایا، پاکستان کی حکومت نے کافی کوشش کی ہے سمگلنگ کو روکنے کی لیکن مکمل کامیابی نہیں ہورہی ہے اسی طرح سے انڈیا اور ایران سے کافی اشیاء سمگل ہوکر پاکستان آجاتی ہیں۔سمگلنگ سے پاکستانی صنعت کو بھی بہت نقصان ہورہا ہے، سمگل شدہ اشیاء کا بائیکاٹ ہونا چاہیے۔

بعض غیر محبِ وطن مسافر گرین چینل سے خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں اس طریقہ کار سے

گورنمنٹ آف پاکستان کو ٹیکس بہت کم تعداد میں مل رہا ہے۔ مسافروں کو چاہئے کہ وہ ایمانداری سے ٹیکس دیں اور گورنمنٹ کو بھی گرین چینل کی پالیسی پر غور کرنا چاہئے، فیڈرل ایجنسیوں کو زیادہ سے زیادہ بااختیار بنانا چاہئے تاکہ سمگلنگ کو روکا جائے۔

اس وقت پاکستان میں 6 ڈیوٹی فری شاپس ہیں جو کراچی، لاہور، اسلام آباد، فیصل آباد، پشاور اور سمبڑیال میں کام کررہی ہیں، ان میں مصنوعی ڈاکومنٹس اور ٹی آر فارم (T.R. Form) کی خرید وفروخت کے ذریعے سمگلنگ ہورہی ہے۔ بے شک محکمہ کسٹم نے مختلف اوقات میں آڈٹ کے ذریعے کافی ریکوری نکالی ہے۔ ڈپلومیٹک بانڈ (Diplomatic Bond) کا بھی کچھ لوگ غلط استعمال کررہے ہیں۔ ڈپلومیٹک بانڈ میں غیرملکی سفیر وغیرہ اپنی ضرورت کی اشیاء منگواتے ہیں جو بعدازاں وہ لوکل مارکیٹ میں مہنگے داموں فروخت کردیتے ہیں کیونکہ پاکستان میں غیرملکی اشیاء خریدنے کا کریز ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان ڈپلومیٹک بانڈ پر سخت چیکنگ رکھی جائے۔

باڑہ مارکیٹ جو صرف قبائلی علاقوں میں تھی اب پورے ملک میں پھیل چکی ہیں، ہر شہر میں باڑہ مارکیٹ کے نام سے مارکیٹ وجود میں آچکی ہے جہاں غیرملکی اشیاء سستے داموں خریدی جاسکتی ہیں اس عمل سے گورنمنٹ آف پاکستان کو کروڑوں روپے کے ٹیکس کا نقصان ہورہا ہے۔ ان مارکیٹوں کو بند کرنے کی ضرورت ہے بے شک پاکستان سے بھی گندم، چاول اور پاکستانی کرنسی افغانستان سمگل ہورہی ہے، اس سمگلنگ سے پاکستان میں گندم، چاول مہنگا ہوجاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہاں سے نوادرات کافی مقدار میں ترقی یافتہ ممالک کو سمگل ہوچکے ہیں۔

بے شک سمگلنگ ایک معاشی ناسور ہے جس سے غریب ممالک کی معیشت تباہ ہورہی ہے۔ ایشیاء کے تمام سمگلروں کا کالا روپیہ ترقی یافتہ ممالک کے بینکوں میں جمع ہے اور جمع ہورہا ہے اور یہی رقم آئی ایم ایف پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کو قرض پر دیتا ہے اور ان مقروض ممالک سے قرضہ بمعہ سود وصول کرتا ہے۔ اگر دونمبر کمائی کرنے والوں کی دولت کو ترقی یافتہ ممالک تحفظ نہ دیں تو کوئی بات نہیں کہ ترقی پذیر ممالک غربت اور

بیروزگاری پر کافی حد تک قابو پالیں۔ ظلم کی بات یہ ہے کہ جب امریکہ دریافت ہوا تو افریقہ کے غریب لوگوں کو یورپ کے سرمایہ دار امریکہ میں غلام بنا کر لے گئے یہ سلسلہ انیسویں صدی کے آخر میں ختم ہوا اب بھی ترقی پذیر ممالک سے بچوں کو خرید کر مڈل ایسٹ ممالک میں سمگل کیا جاتا ہے، وہاں اونٹ کے اوپر باندھ دیا جاتا ہے، جوں جوں بچے چیختے ہیں اونٹ تیز بھاگنا شروع کر دیتے ہیں اس طرح اونٹ ریس دلچسپ ہو جاتی ہے اشیاء کی سمگلنگ کے ساتھ ساتھ انسانی سمگلنگ بہت بڑا ظلم ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سمگلنگ کو روکا جا سکتا ہے، حکومتِ پاکستان اس سلسلہ میں سمگلنگ کو روکنے کے لیے مختلف اقدامات کر رہی ہے۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ ایگریمنٹ 1965ء میں تبدیلی لا رہی ہے تا کہ صرف وہی اشیاء کراچی کی بندرگاہ کے راستے افغانستان میں لائی جائیں جن کی افغانستان میں ضرورت ہے۔ ایسی اشیاء جن کی وہاں فیکٹریاں نہیں ہیں یا وہاں ان کی کنزمشن (Consumption) نہیں ہے وہاں وہ اشیاء نہ لائی جائیں کیونکہ یہی اشیاء پاکستان میں سمگل ہو جاتی ہیں۔ ڈیوٹی فری شاپس، گرین چینل، ڈپلومیٹک بانڈ اور باڑہ مارکیٹوں کی سمگلنگ روکنے کے لیے حکومتِ پاکستان مختلف ٹیمیں تشکیل دے رہی ہے جو کہ سرپرائز وزٹ کریں گی اور سمگلنگ کو روکیں گی۔ بے شک موجودہ سنٹرل بورڈ آف ریونیو کے چیئرمین کے ہوتے ہوئے سمگلنگ کو روکنا ممکن ہے۔ انھوں نے سمگلنگ کو روکنے کے لیے حکومتِ پاکستان کی ہدایت پر مختلف احکامات جاری کیے ہیں، حکومتِ پاکستان نے نہایت فرض شناس اور ایماندار افسروں کو تعینات کیا ہے امید کی جا سکتی ہے کہ پاکستان سمگلنگ جیسے معاشی ناسور پر قابو پالے گا۔

کاٹیج انڈسٹری کا معاشی ترقی میں کردار

سیلز ٹیکس قوانین کے مطابق کاٹیج انڈسٹری سے مراد وہ انڈسٹری ہے جس کا مالک ایک آدمی ہو وہ خود بھی ورکر کی حیثیت سے کام کرتا ہو، اس کی سالانہ سیل 50 لاکھ سے زیادہ نہ ہو ، مزدوروں کی تعداد بھی 15 مزدوروں سے زیادہ نہ ہو، اس کے علاوہ وہ کوئی دوسرا کاروبار یا انڈسٹری نہ رکھتا ہو، اس پر سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس کا اطلاق نہیں ہوتا ہے۔ سیلز ٹیکس قوانین کے مطابق کاٹیج انڈسٹری کی صنعتوں میں دستی کھڈی صنعت، شربت سازی، جفت سازی، صابن سازی، بیکری کی اشیاء، فرنیچر بنانا، چاقو چھریاں بنانا، برتن بنانا، ماہی گیری اور پلاسٹک کی مصنوعات وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک نے معاشی ترقی کی ہے تو اس کے پیچھے کاٹیج انڈسٹری آپ کو ضرور نظر آئے گی جیسے کہ جرمن، یورپ اور جاپان وغیرہ اس کی تازہ ترین مثالیں ہیں۔

کسی بھی ملک کی معاشی ترقی میں کاٹیج انڈسٹری بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ دنیا میں سب سے پہلے جرمنی نے کاٹیج انڈسٹری کی اہمیت کو تسلیم کیا اور کاٹیج انڈسٹری کی ترقی کے لیے باقاعدہ سرکاری محکمہ تشکیل دیا۔ ایشیاء میں سب سے پہلے جاپان نے اپنے وسائل کا رُخ چھوٹی اور درمیانی صنعتوں کی ترقی کے لیے اداروں کا قیام اور وسائل کی مناسب تقسیم کا سلسلہ جاری ہے۔ جاپان میں نجی شعبہ اور حکومت مل کر اس جانب پیش رفت کر رہے ہیں۔ نجی شعبہ، چھوٹی و درمیانی صنعتوں کی ترقی کے مواقع اور ان کی راہ میں حائل دشواریوں کی نشاندہی کرتا ہے، جبکہ حکومت ان مواقع سے استفادہ کرنے اور ان کی راہ میں حائل مشکلات کو دور کرنے کے لیے مددگار ادارے قائم کر کے نجی شعبہ کی مدد کرتی ہے۔ یورپ اور امریکہ نے جاپان کے صنعتی زوال لانے کی بہت کوشش کی ہے لیکن وہ ناکام رہے ہیں کیونکہ جاپان نے اپنے ملک میں چھوٹی صنعتوں کا جال بچھا رکھا ہے۔ صنعتی زوال لانے کی کوشش

یورپ اور امریکہ کی انڈونیشیا میں کامیاب ہوگئی ہے کیونکہ وہاں چھوٹی اور درمیانی صنعت بہت ہی کم تھی۔

پاکستان کی معاشی ترقی میں گوجرانوالہ ڈویژن کی کاٹیج انڈسٹری کا بہت زیادہ کردار ہے، آبادی کے لحاظ سے گوجرانوالہ 7ویں نمبر پر ہے اور گوجرانوالہ ڈویژن کا ایک شہر سیالکوٹ آبادی کے لحاظ سے 9ویں نمبر پر ہے۔ گوجرانوالہ کی آبادی 1901ء کے اعداد وشمار کے مطابق 29 ہزار تھی جو کہ 1994ء کے اعداد وشمار کے مطابق 15 لاکھ تھی آبادی میں اضافہ کی رفتار گوجرانوالہ شہر کی، پاکستان کے تمام شہروں سے زیادہ ہے جو کہ تقریباً 7.4 فیصد ہے۔ آبادی میں اضافہ کی رفتار کی اہم وجہ یہاں کی معاشی ترقی ہے، معاشی ترقی کی وجہ سے مختلف شہروں سے آکر یہاں لوگ روزگار کے سلسلہ میں منتقل ہوئے ہیں اور یہاں مستقل آباد ہوگئے ہیں، معاشی ترقی کی اہم وجہ یہاں کاٹیج انڈسٹری کا ہونا ہے۔ گوجرانوالہ کی صنعتی ترقی میں مین کردار فونڈری کی صنعت کا ہے، پنجاب کے تقریباً تمام بڑے شہر یہاں سے ڈھلائی اور ڈائی کاسٹنگ کروا کے اپنے شہروں میں لے جاتے ہیں۔ فونڈری کی صنعت گوجرانوالہ کی سب سے پرانی صنعت ہے علاوہ ازیں فین انڈسٹری، میٹل انڈسٹری، واشنگ مشین انڈسٹری، ٹیکسٹائل انڈسٹری، الیکٹریکل انڈسٹری، براس فٹنگ انڈسٹری، برتن سازی کی صنعت اور سرامکس انڈسٹری وغیرہ وغیرہ مشہور ہیں۔ یہاں دوسرے شہروں کی طرح انڈسٹریل لارڈز اور فیوڈل لارڈز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ معیار زندگی عام آدمی کا مناسب ہے۔ جہاں کاٹیج انڈسٹری ہوگی وہاں غیر مساوی تقسیم دولت، اجارہ داری اور بے روزگاری کا خاتمہ ہوگا یہی حال سیالکوٹ سٹی کا ہے، اسے پاکستان کا ایکسپورٹ سٹی کہتے ہیں، یہاں کی معاشی ترقی میں بھی کاٹیج انڈسٹری کا ہی ہاتھ ہے، یہاں سے سرجیکل گڈز، سپورٹس گڈز اور لیدر گڈز وغیرہ غیر ممالک میں ایکسپورٹ کی جاتی ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے گورنمنٹ آف پاکستان دوسرے شہروں میں بھی کاٹیج انڈسٹری کی ترقی کے لیے کام کرے اور وہاں ادارے بنائے، جیسا کہ ملتان ڈویژن میں ایک طرف تو فیوڈل لارڈز ہیں تو دوسری طرف انڈسٹریل لارڈز ہیں۔ کاٹیج انڈسٹری کی وجہ

سے ہی پیداوار میں اضافہ، روزگار میں اضافہ، غیر مساوی تقسیم کا خاتمہ اور آمدنی میں اضافہ ہوسکتا ہے، جب کاٹیج انڈسٹری بڑھے گی تو ملک معاشی طور پر خوشحال ہوگا کاٹیج انڈسٹری کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت ہے، کاٹیج انڈسٹری میں پبلسٹی اور پراپیگنڈہ سے بھی پرہیز کیا جاتا ہے اور یہ اخراجات بچ جاتے ہیں، اس وجہ سے کاٹیج انڈسٹری میں جو شے تیار ہوگی وہ عوام کو سستی ملے گی، مالک اور مزدور کا رشتہ یہاں دوست کی حیثیت میں بدل جاتا ہے، مالک اور مزدور اکھٹے محنت کرتے ہیں اسی وجہ سے مزدور کے اندر احساسِ کمتری ختم ہوجاتا ہے، کاٹیج انڈسٹری کے مزدور ہڑتال وغیرہ میں بھی نہ ہونے کے برابر شرکت کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت نے چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کے مختلف اقدامات کیے ہیں جن میں سمیڈا کا قیام بھی شامل ہے۔ سمیڈا سے مراد سمال اینڈ میڈیم انٹر پرائزز ڈویلپمنٹ اتھارٹی ہے۔ علاوہ ازیں بھی کچھ اقدامات کرنے کی ضرورت ہے جو درج ذیل ہیں۔

فرانس اور یورپ کے ممالک میں بجلی کا نظام، پاکستان کے ٹیلی فون کے نظام جیسا ہے۔ چھٹی کے دن اور رات کو ٹیرف تبدیل ہوجاتا ہے جیسا کہ پاکستان میں ٹیلی فون کا ٹیرف رات اور چھٹی کے دن تبدیل ہوجاتا ہے، اس طرح درمیانے درجے کا آدمی رعایتی وقت میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو ٹیلی فون کرتا ہے جبکہ کاروباری لوگ اور سرکاری دفتروں کے افسرز دفتری اوقات میں ٹیلی فون کرتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان میں بھی بجلی کا ٹیرف رات کو اور چھٹی والے دن تبدیل ہوجائے تاکہ کاٹیج انڈسٹری کے مالک رات کو سستی بجلی سے فائدہ اُٹھا سکیں اور سستی اشیاء مارکیٹ میں پہنچیں، کیونکہ بجلی کو سٹور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حال ہی میں حکومت نے ٹیوب ویل بجلی کے فلیٹ ریٹ کیے ہیں اُمید ہے اس سے فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ ہوگا۔

اس وقت سیلز ٹیکس معافی کی حد سالانہ 50 لاکھ روپے ہے اس کے اوپر سیل پر سیلز ٹیکس کا نفاذ ہوجاتا ہے۔ مزید ضرورت ہے کہ ہوم اینڈ کاٹیج انڈسٹری کو قرضے آسان شرائط پر دیئے جائیں کیونکہ پاکستان میں اس وقت بڑی کمپنیوں کے قرضہ حاصل کرنے کی شرح

تقریباً 80 فیصد اور چھوٹی انڈسٹری کے قرضہ حاصل کرنے کی شرح 20 فیصد ہے بڑی کمپنیوں میں روزگار کی شرح 30 فیصد اور چھوٹی انڈسٹری میں روزگار کی سطح 70 فیصد ہے جبکہ یورپ اور جاپان میں انڈسٹری کا نظام اس کے اُلٹ ہے وہاں چھوٹی انڈسٹری کو زیادہ سہولت دی گئی ہے۔ بے شک سمیڈا کا قیام چھوٹی صنعتوں کی ترقی کے لیے ہی کیا گیا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر سختی سے عمل کیا جائے۔

حکومت نے تقریباً ہر ڈویژن میں تربیتی اداروں کا قیام عمل میں لایا ہے، مزید فنی اداروں کا قیام عمل میں لانا چاہئے اور اس کی تشہیر ہونی چاہئے، جیسا علاقہ ویسے تربیتی مراکز وہاں قائم ہونے چاہئے، ان اداروں میں 3 ماہ، 6 ماہ کے شارٹ کورس ہونے چاہئے، وہاں ہر انڈسٹری کے بارے میں اُردو میں کتاب دستیاب ہونی چاہئے، ہر ڈویژن میں ایک تحقیقاتی لیبارٹری ہونی چاہئے تا کہ غیر ملکی مصنوعات کا تجزیہ کیا جا سکے اور اسے پاکستان میں بنایا جا سکے جیسا کہ چائنہ اس وقت یہی کام کر رہا ہے۔ کوئی وجہ نہیں ایسی ہے کہ اگر پاکستان میں ایک اچھا انڈسٹریل سیٹ اَپ قائم کر دیا جائے تو پاکستان معاشی ترقی نہ کرے پاکستان کے لوگ کسی بھی ملک کے محنتی لوگوں سے کم محنتی نہیں ہیں ،صرف ایک اچھا نظام چاہئے اگر یہاں میرٹ پر قرضے دیئے جائیں تو کاٹیج انڈسٹری کو فروغ حاصل ہوگا، بے شک کاٹیج انڈسٹری کے مالکان کی محنت اور روپیہ ہی پاکستان میں گردش کرتا ہے، زیادہ تر بڑے صنعت کار، کاروباری لوگ اور فیوڈل لارڈز تو اپنی رقم کو غیر ممالک کے بینکوں میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔

بے روزگاری

بے روزگاری سے مراد ایسی صورت حال ہے جب کسی ملک کے افراد کام کرنے کے اہل ہوں اور کام کرنا چاہتے ہوں لیکن موزوں اجرت پر اس کی قابلیت اور تربیت کے مطابق کام نہ ملے تو ایسی صورت حال کو بے روزگاری کہا جائے گا۔ ترقی یافتہ ممالک میں بیروزگاری کی تعداد 2 سے 5 فیصد تک ہے۔ ان بیروزگار افراد کو بیروزگاری الاؤنس بھی ملتا ہے جو ملک میں کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو جسمانی یا دماغی طور پر کام کرنے کے قابل نہیں ہوتے مثلاً بوڑھے، اندھے، پاگل اور اپاہج افراد یا ایسے افراد جو کام نہیں کرنا چاہتے مثلاً پیر فقیر، سادھو وغیرہ وغیرہ علاوہ ازیں ملکی آبادی کا خطیر حصہ ایسے افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو کم سنی میں ہوتے ہیں اور کام نہ کر سکتے ہیں اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں بیروزگاری بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی وجوہات، اثرات اور حل کے لیے چند تجاویز ہیں۔

اس وقت پاکستان میں سب سے زیادہ بیروزگاری زراعت میں ہے، یہاں بیروزگاری کا تناسب 20 سے 25 فیصد ہے۔ زراعت میں ان کام کرنے والے کو مستور بیروزگار کہا جائے گا یہ موسمی فصل اُگاتے ہیں اور بعد میں فارغ بیٹھے رہتے ہیں اسی طرح صنعت میں بھی موسمی بیروزگاری ہے مثلاً پنکھے بنانے والے کارخانے تین ماہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں، اس طرح تین ماہ کے لیے بیروزگاری پھیل جاتی ہے۔

پاکستان کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے لیکن مناسب منصوبہ بندی نہیں ہو رہی اس وجہ سے بیروزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ پاکستان، چائنہ کی طرح منصوبہ بندی کرے اور آبادی کو معاشی ترقی کے لیے استعمال کرے۔

پاکستان میں سرمائے کا غلط استعمال ہو رہا ہے، غیر ممالک میں محنت کرنے والے پاکستانی اپنی رقم مثبت استعمال نہیں کر رہے ہیں، پہلے وہ لوگ کوشش کرتے تھے کہ ان کے

بھائی بیٹے پاکستان میں رہ کر کوئی کاروبار تشکیل دیں تا کہ غیر ممالک سے واپس آ کر وہ کاروبار میں شریک ہو جائے لیکن اب ایسا نہیں ہو رہا کیونکہ کاروبار کرنا بہت پیچیدہ عمل ہو چکا ہے، اب یہ لوگ اپنی رقم سے فارن کرنسی خریدتے ہیں یا پھر سونے کے لسکٹ خریدتے ہیں اس طرح رقم دوبارہ سرمایہ دار ممالک کے پاس چلی جاتی ہے۔ ملک میں روزگار نہیں پھیلتا بلکہ بیروزگاری پھیلتی ہے۔ ہر سال پاکستانی روپے کی ڈی ویلیوایشن ہو جاتی ہے، فیکٹری لگانے میں رِسک ہے جبکہ مندرجہ بالا دونوں کاموں میں کوئی رِسک نہیں ہے پاکستان کے اندر رہ کر بہت سے سرمایہ دار فارن کرنسی کی خرید و فروخت کر رہے ہیں یہ دونوں کاروبار کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں نہیں ہوتے ہیں۔ کرنسی بزنس اور سونے کے بزنس کی وجہ سے بے روزگاری میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، معیشت سکڑ رہی ہے، امپورٹ اور ایکسپورٹ دونوں کم ہو گئی ہے، امپورٹ آئٹم میں پہلا نمبر فارن کرنسی کا ہی ہے۔

پاکستان میں زیادہ تر تعلیم جنرل ایجوکیشن کی دی جاتی ہے، جنرل ایجوکیشن سے بے روزگاری پھیل رہی ہے، جنرل ایجوکیشن کے ادارے اس وقت بیروزگاری پھیلانے کے کارخانے بنے ہوئے ہیں، بی اے پاس کلرک ملازمت کے لیے ترس رہے ہیں جبکہ سرمایہ دار ممالک میں جنرل ایجوکیشن کے مقابلہ میں فنی ادارے ہیں ان اداروں سے فارغ ہونے کے بعد طالب علموں کو روزگار کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

سیاسی بحران اور فرسودہ رسم و رواج بھی مقامی سرمایہ دار کو کارخانہ لگانے سے روکتے ہیں ایک حکومت کچھ پالیسی بناتی ہے، دوسری حکومت کچھ پالیسی بناتی ہے۔ مستقل پالیسی نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ سرمایہ کاری نہیں ہو رہی ہے علاوہ اَزیں جسمانی محنت کرنے والے کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔

بیروزگاری کے منفی اثرات ہو رہے ہیں جنرل ایجوکیشن حاصل کر کے جن طالب علموں کو باعزت روزگار نہیں ملتا ہے ان میں خودکشی کا رجحان پیدا ہو رہا ہے جو کہ بہت غلط رجحان ہے، کچھ بیروزگار جرائم کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تعلیم یافتہ مجرموں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تعلیم سے نفرت ہو رہی ہے جو کہ بہت خطرناک رجحان ہے ضرورت اس بات کی ہے

کہ فنی ادارے زیادہ سے زیادہ کھولے جائیں یا جنرل ایجوکیشن کے اداروں کو فنی اداروں میں تبدیل کر دیا جائے۔

بے روزگاری کے حل کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان بھی یورپ والا طریقہ اختیار کرے، یورپ والوں کی جب پیداوار ان کی ضرورت سے بڑھ گئی تو انھوں نے نئی منڈیاں تلاش کی آسٹریلیا اور امریکہ دریافت کیا، وہاں منصوبہ بندی کے تحت اپنی آبادی اور اشیاء کو بھیجا اب امریکہ میں اصل امریکن نہ ہونے کے برابر ہیں ان سے بہت زیادہ یورپین امریکن ہیں اور یہ ہی وسائل پر قابض ہیں۔ اکثریت سیاستدانوں کے ماں باپ یورپ سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ پاکستان کو بھی منصوبہ بندی کے تحت امریکہ، آسٹریلیا، کینیڈا اپنی فالتو لیبر بھیجنی چاہئے تا کہ یہ پاکستان کے لیے معقول آمدنی کا ذریعہ بنے اور آہستہ آہستہ وہاں کے ممالک کی سیاست میں قدم رکھے جیسے کہ یورپین نے امریکہ اور آسٹریلیا میں کیا۔ فارن کرنسی اکاؤنٹ فریز کرنے سے کافی نقصان ہوا ہے اب بینکوں کے ذریعے فارن کرنسی تارکینِ وطن کم بھیج رہے ہیں یہ رقم فارن کرنسی ایکسچینجز کے ذریعہ زیادہ آ رہی ہے۔ اس کے معیشت پر منفی اثرات ہو رہے ہیں۔ ان لوگوں کو صنعت کاری کے لیے قائل کیا جائے، ٹیکس سسٹم کو بہت بنایا جائے تا کہ مقامی سرمایہ کار اپنی رقم فارن کرنسی اور سونے کی خرید و فروخت کی بجائے صنعت کاری میں لگائیں اس طرح متوازی معیشت کا خاتمہ ہوگا۔ پیداوار کا تعین کیا جائے کہ کونسی پیداوار اس سال ہونی ہے اور اس پیداوار کو کس طرح استعمال کرنا ہے۔ فالتو پیداوار کو ایکسپورٹ کیا جائے، زراعت میں جاگیردارانہ نظام کو ختم کیا جائے، غیر حاضر جاگیردار زمین کو ووٹ حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، زمین کو پیداوا کے لیے استعمال نہیں کرتے ہیں اس وجہ سے زرعی تعلیم عام نہیں ہو رہی، فی ایکٹر پیداوار کم ہے۔ جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنے کی وجہ سے ہی انڈیا کی فی ایکڑ پیداور ہم سے دوگنا ہے وگرنہ پاکستانی جسمانی اور دماغی لحاظ سے انڈین سے بہت بہتر ہیں۔ فرسودہ رسم و رواج کا خاتمہ کیا جائے، ٹی وی اور ریڈیو پر فضول رسم و رواج کے خلاف ڈرامے پیش کیے جائیں تا کہ عوام کو ان رسومات سے نفرت پیدا ہو، محنت کی عظمت اُجاگر کی جائے، اچھے

صنعت کاروں کو ایوارڈ دیا جائے، ٹیکس سسٹم کو آسان کیا جائے تا کہ کاروبار کو فروغ حاصل ہو، کاروبار بڑھے گا تو روزگار بھی بڑھے گا، روزگار بڑھے گا تو جرائم میں بھی کمی ہوگی، قومی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ جنرل ایجوکیشن کے اداروں کی بجائے فنی ادارے کھولے جائیں ،اس طرح بیروزگاری کا کسی حد تک خاتمہ ہو جائے گا۔ بے شک ملک کے اندوسائل کی کوئی کمی نہیں ہے صرف اچھے سسٹم کی کمی ہے کوئی بھی ملک اتنی دیر تک خوشحال نہیں ہوسکتا جتنی دیر تک اس میں سسٹم اچھا نہیں ہوگا۔

وفاقی بجٹ

1999-2000ء (جائزہ)

ہر حکومت کو ہر سال اپنی متوقع آمدنی اور متوقع اخراجات کا حساب لگانا پڑتا ہے، یہی حساب / ڈیٹا بجٹ کہلاتا ہے۔ بجٹ کسی بھی ملک کی معاشی حکمتِ عملی کا اہم جزو ہوتا ہے، بجٹ کے مطالعہ سے ملک کی اقتصادی صورتحال سمجھی جاسکتی ہے۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے پہلے بجٹ 49-1948ء کا حجم 89 کروڑ 57 لاکھ تھا جو اب 2000-1999ء میں بڑھ کر 6 کھرب 42 ارب 20 کروڑ روپے ہوگیا ہے، ہر بار بجٹ پیش کرتے ہوئے قوم سے قربانی مانگی گئی ہے، ہر بار یہ خوشخبری سنائی گئی کہ صرف یہ سال سخت ہے اگلے سال سے حالات میں بہتری شروع ہوجائے گی، بجٹ کی تین اقسام ہیں:

(1) فاضل بجٹ

(2) خسارے کا بجٹ

(3) متوازن بجٹ

1- فاضل بجٹ سے مراد وہ بجٹ ہے جس میں حکومت کی آمدنی زیادہ اور اخراجات کم ہوتے ہیں۔

2- خسارے کے بجٹ میں حکومت کی آمدنی کم اور اخراجات زیادہ ہوتے ہیں۔

3- متوازن بجٹ میں آمدنی اور اخراجات برابر ہوتے ہیں۔

موجودہ بجٹ برائے مالی سال 2000-1999ء ایک متوازن بجٹ ہے اس بجٹ کے درج ذیل اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ہیں:

(1) معاشی ترقی کی رفتار تیز کرنا

(2) معاشی ترقی کے راستے میں مشکلات کا خاتمہ کرنا

(3) ملک کی سرحدوں کی حفاظت کی ضمانت دینے کے لیے دفاع کو مضبوط بنانا

(4) افراطِ زر کی روک تھام

(5) غیر مساوی تقسیم دولت کا خاتمہ

(6) مہنگائی کو کم کرنا، غریب اور امیر کا فرق کم کرنا وغیرہ وغیرہ۔

1999-2000ء کے لیے نئے وفاقی بجٹ کا حجم 6 کھرب 42 ارب 20 کروڑ روپے ہے، اس بجٹ میں ترقیاتی اخراجات کے لیے 116 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں جو مجموعی اخراجات کا 18.66 فیصد ہیں، دفاع پر 142 ارب روپے خرچ ہوں گے جس کا تناسب 22.11 فیصد ہے، 138 ارب روپے صوبوں کو ادا کیے جائیں گے، صوبوں کا یہ حصہ گذشتہ بجٹ کی نسبتاً 13 ارب اور 46 کروڑ کم ہے، صوبوں کو ادائیگی کے بعد وفاقی حکومت کو تقریباً 423 ارب کے وسائل حاصل ہوں گے جو گذشتہ مالی سال کے مقابلے میں 10.3 اور نظر ثانی شدہ تخمینہ سے 11.2 زیادہ ہیں۔ حکومتِ پاکستان کو آئندہ مالی سال کے دوران بیرونی ذرائع سے 185 ارب جبکہ اندرونی ذرائع سے 44 ارب کے وسائل حاصل ہوں گے۔ اخراجات جاریہ میں سود کی ادائیگی اور قرضوں کی واپسی پر مجموعی طور پر 287 ارب روپے صرف ہوں گے جو بجٹ کا 44.77 فیصد بنتے ہیں جبکہ سول انتظامیہ کے لیے 148 ارب روپے رکھے گئے ہیں۔ حکومت نئے مالی سال میں ترقیاتی شعبے میں سڑکوں پر 19 ارب، بجلی پہنچانے پر 7.5 ارب، تعمیرِ وطن 3 ارب، تعمیر سندھ 50 کروڑ، صوبائی ترقیاتی پروگرام تقریباً 13 ارب، سوشل ایکشن پروگرام پر 16 ارب روپے خرچ کرے گی۔ ٹرانسپورٹ اور نقل و حمل کے شعبے میں 5.3 فیصد، تجارتی شعبہ میں 4.8، انشورنس اور فنانس سیکٹر میں 5 فیصد جبکہ پبلک ایڈمنسٹریشن اور ڈیفنس سیکٹر میں 3.5 فیصد اضافہ کی توقع ظاہر کی گئی ہے۔

1999-2000ء کے بجٹ میں ٹیکس تجاویز کے ضمن میں بہت سی تبدیلیاں کی گئی ہیں، اہم تبدیلیاں کچھ یوں ہیں۔

1- 2.50 فیصد سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی کمرشل پیپر امپورٹر اور پرنٹ میڈیا پیپر امپورٹر پر

لگادی گئی ہے۔

2- کریڈٹ کارڈ پر 1.50 فیصد سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی لگادی گئی ہے۔

3- شوگر، سیمنٹ، کیلشیم کاربائیڈ، فارمک ایسڈ، شمپو، جوٹ بیگ، ایل پی سلنڈر، پوڈر، ٹیپ، فلم، فائبر، پیپر اینڈ پیپر بورڈ وغیرہ وغیرہ کی درآمد پر سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی لگادی گئی ہے۔

4- بینک چیک پر سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی 2 روپے سے بڑھا کر 4 روپے فی چیک کردی گئی ہے۔

5- کوریئر سروس (Courier Service) پر 12-1/2 فیصد سے سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی بڑھا کر 15 فیصد کردی گئی ہے۔

6- لوکل کال کے نرخوں میں 35 پیسے، لائین رینٹ میں 55 روپے اور نئے ٹیلی فون کنکشن کی فیس میں 390 روپے اضافہ کردیا گیا ہے۔

7- لبری کیٹنگ آئل اور ٹرانسفر آئل پر 7.50 روپے فی لیٹر یا 10 فیصد فی لیٹر سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی کا نفاذ کردیا گیا ہے۔

8- مشروبات پر ٹیکس لگاتے وقت ویلیو سے چلنگ چارجز منفی کرنے کی سہولت ختم کردی گئی ہے۔

9- تمام انعامی سکیموں پر 10 فیصد کے حساب سے اِنکم ٹیکس کی کٹوتی کا نفاذ ہوگا۔

10- چینی کی مجموعی پیداوار کا 5 فیصد برآمد نہ کرنے والی شوگر ملکوں کی پیداوار میں ایک روپیہ 85 پیسے فی کلوگرام کے حساب سے سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی کا نفاذ کردیا گیا ہے۔

11- بسوں اور کاروں کی مختلف مشینری کی درآمد پر ڈیوٹی کی چھوٹ ختم کردی گئی ہے۔

12- خوردنی تیل پر ڈیوٹی میں اضافہ کردیا گیا ہے۔

13- غیر رجسٹرڈ خریداروں پر سیلز ٹیکس کی شرح 16 فیصد سے بڑھا کر 18 فیصد کردی گئی ہے۔

14- کاٹن یارن پر سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی کا نفاذ کردیا گیا ہے۔

بے شک نئے ٹیکس لگنے سے افراطِ زر بڑھے گا، اشیاء مہنگی ہوں گی، بجٹ سے پہلے بھی پیٹرول اور ڈیزل کی قیمتوں میں 13 فیصد تک اضافہ کیا جاچکا ہے، بجلی کی سبسڈی میں بھی کمی کردی گئی ہے، مہنگائی کے اثرات کو کوزائل کرنے کے لیے حکومت نے عوام کے لیے کچھ مراعات کا بھی اعلان کیا ہے جو کہ درج ذیل ہیں۔

1- سرکاری ملازموں کی تنخواہوں میں آخری بار اضافہ پانچ سال قبل 1994ء میں کیا گیا تھا اس کے بعد بجٹ برائے مالی سال 2000-1999ء ملازمین کے گریڈ ایک سے سولہ تک بنیادی تنخواہ کا 25 فیصد اور گریڈ سترہ سے بائیس تک 20 فیصد اضافہ کیا گیا ہے۔ پنشنوں میں بھی اضافہ اسی شرح سے ہوگا یہ ایک انقلابی قدم ہے جس کی ہر سرکاری ملازم اور غیر سرکاری ملازم نے تعریف کی ہے، اس سے ایمانداری کو فروغ حاصل ہوگا۔

2- نئے وفاقی بجٹ کا سب سے اہم فیصلہ چونگی اور ضلع ٹیکس کے نظام کا خاتمہ ہے ، چونگی ٹیکس نظام انگریز دور سے شروع ہوا تھا اور ضلع ٹیکس کا نظام سابقہ مارشل لاء دور میں شروع ہوا۔ ضلع ٹیکس کا نظام دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں نہیں ہے اس اقدام سے زمینداروں، صنعت کاروں اور عوام کو ریلیف ملا ہے۔ ضرورت ہے کہ صنعت کار طبقہ کسٹم ڈیوٹی، سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی، سیلز ٹیکس اور اِنکم ٹیکس کی صورت میں ایمانداری سے ٹیکس دے۔

3- ریڈیو لائسنس فیس کے خاتمہ سے عام آدمی کو ریلیف ملا ہے۔ علاوہ ازیں لائیوسٹاک فیڈ سے سیلز ٹیکس کا خاتمہ کر دیا گیا ہے تا کہ عوام تک سستی اشیاء پہنچیں۔

4- بلڈوزر اور اینگل ڈورز کی درآمد پر کسٹم ڈیوٹی ختم کر دی گئی ہے۔

5- کاٹیج انڈسٹری کے فروغ کے لیے چھوٹے کارخانہ داروں کے لیے سیلز ٹیکس کی چھوٹ کی حد 3 لاکھ سالانہ سیل سے بڑھا کر 5 لاکھ سالانہ سیل کر دی گئی ہے، یہ کاٹیج انڈسٹری کے فروغ کے لیے ایک انقلابی قدم ہے، کاٹیج انڈسٹری ہی کی بنیاد پر جاپان نے امریکہ سے انڈسٹری میں شکست نہیں کھائی، انڈونیشیا کی معیشت کو نقصان ہی اس وجہ سے ہوا ہے کہ وہاں کاٹیج انڈسٹری نسبتاً کم تھی۔ مزید یہ کہ کاٹیج انڈسٹری کو سہولت یہ دی گئی ہے کہ اگر کاٹیج انڈسٹری کی سیل 5 لاکھ سے اوپر اور 25 لاکھ سے کم ہے تو وہ دو فیصد کے حساب سے سیلز ٹیکس جمع کروائے گا، چھوٹے۔ صنعت کاروں نے اس بجٹ کو بہت سراہا ہے۔

6- ایک تو ٹیلی فون پر ایکسائز ڈیوٹی 25 فیصد سے کم کر کے 15 فیصد کر دی گئی ہے علاوہ ازیں اینٹوں اور سیمنٹ بلاکس پر سیلز ٹیکس کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اس طرح پلاسٹک مصنوعات پر سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

7- اچھے ٹیکس گزاروں کے لیے سالانہ ایوارڈ کا اعلان کیا گیا ہے جس کی بہت سخت ضرورت تھی کیونکہ پاکستان میں اچھے کاموں کے لیے ایوارڈ دینے کی رسم بہت کم ہے۔

مجموعی طور پر یہ ایک اچھا بجٹ ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شعبہ میں ایک سسٹم کا نفاذ کیا جائے۔ ہوم اینڈ کاٹیج انڈسٹری کو جو ٹیکس میں سہولتیں دی گئی ہیں اس کی پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا پر وضاحت کی جائے کیونکہ کاٹیج انڈسٹری کو چلانے والا طبقہ ٹیکس کی پیچیدگیاں نہیں سمجھتا مزید ضرورت ہے کہ ہوم اینڈ کاٹیج انڈسٹری کو قرضہ آسان شرائط پر دیا جائے کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جن کی محنت اور سرمایہ ملک کے اندر گردش کرتا ہے، بڑے سرمایہ دار تو جب چاہے سرمایہ ترقی یافتہ ممالک میں منتقل کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہر ضلع میں اس ضلع کی انڈسٹری اور زرعی پیداوار کے مطابق فنی ادارے کھولنے چاہئیں، علاوہ ازیں ہر ڈویژن میں تجرباتی و تحقیقاتی لیبارٹری ہونی چاہئے جہاں سے امپورٹڈ اشیاء تجزیہ کروا کے اس کو مقامی لیول پر تیار کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔ چائنہ نے یہی حکمت عملی اپنائی ہوئی ہے اس طرح صنعتی ترقی بھی ہوگی اور فی ایکڑ پیداوار میں بھی اضافہ ہوگا۔ سائنسی اور تحقیقاتی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ ہونا چاہئے اور اس کے لیے باقاعدہ فنڈ ہونا چاہئے تاکہ جدید علوم سے ہمارے طالب علم روشناس ہوں۔ سائنسی علوم ہی کی بنیاد پر جاپان، جرمن، چائنہ اور یو۔ ایس۔ اے (USA) ہم سے آگے ہیں وگرنہ پاکستان میں وسائل کی کمی نہیں ہے۔ کرنسی ڈی ویلیوایشن کے کنٹرول کے لیے ضروری ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے درمیان تجارت کو فروغ دیا جائے اس طرح ڈالر اور پاؤنڈ کی ضرورت نہیں رہے گی۔ جاپان کی طرح انسانی وسائل کی منصوبہ بندی کی جائے اور اس کی تشہیر کی جائے اس سال انجینئرز کی اتنی ضرورت ہے، ڈاکٹرز کی اتنی ضرورت ہے اور پروفیسرز کی اتنی ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ اور فلاں چیز کی پیداوار اتنی ہونی چاہئے، اس منصوبہ بندی سے بیروزگاری میں کمی ہوگی اور ملک صنعتی اور زرعی طور پر ترقی کرے گا، بے شک موجودہ بجٹ ایک متوازن بجٹ ہے۔

معیشت اور ثقافت

کسی ملک کی معاشی ترقی کا انحصار صرف معاشی عوامل پر ہی نہیں ہوتا، ثقافت بھی اس ملک کی معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پاکستان کی معیشت میں ثقافت کے کردار کو سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم علم معاشیات اور ثقافت کے مفہوم کو سمجھ لیں۔

علمِ معاشیات کے موضوع پر سب سے پہلے آدم سمتھ کی کتاب ''دولتِ اقوام'' 9 مارچ 1776ء کو بازار میں آئی اسی وجہ سے آدم سمتھ کو بابائے اقتصادیات کہتے ہیں یہ کتاب سو سال تک عام قاری کی اپروچ سے دور رہی علمِ معاشیات وہ علم ہے جو پیداوار، پیداوار کی تقسیم، دولت، دولت کی تقسیم اور معاشی ترقی کرنے میں مدد دیتا ہے جس طرح ہندوستان میں برہمنوں نے شودروں کو علم حاصل کرنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اس طرح اب بھی سرمایہ دار ممالک یہ کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی ممالک کے طالب علم جدید علوم سے ناواقف رہیں مثلاً آرمز اینڈ آرمز ایمونیشن، کیمیکلز، کمپیوٹر ٹیکنالوجی، میڈیسن، میٹل انجینئرنگ وغیرہ وغیرہ کی تعلیم نہ حاصل کر سکیں کیونکہ اسی بنا پر وہ سرمادار ممالک کی صف میں شامل ہیں۔ پاکستان میں سیاست کے موضوع پر ایک تانگہ بان سے لے کر ڈاکٹر تک بحث کرتا ہے لیکن قومی معیشت پر بحث کرنا ہماری ثقافت کا حصہ نہیں ہے حالانکہ اس پر بھی بحث ہونی چاہئے بلکہ مباحثے ہونے چاہئیں۔

ثقافت فرد کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ شخصیت کی نشوونما کا دارومدار اس کے معاشرتی ماحول پر ہوتا ہے۔ معاشرتی ماحول ایک بہت وسیع مفہوم ہے جس میں سیاسی، معاشی، مذہبی، ادبی غرضیکہ زندگی کے تمام پہلو شامل ہیں۔ بالفاظِ دیگر معاشرتی ماحول کو ہم ثقافت کہہ سکتے ہیں ثقافت میں مندرجہ ذیل خصوصیات ہوتی ہیں:

(1) کتابی (2) ترسیل

(3) سماجی (4) تصوری

(5) تسکین بخش (6) مطابقت

(7) اتصال۔

ثقافت کی تین اقسام ہیں:

(1) مادی ثقافت

(2) غیر مادی ثقافت

(3) کردار

پاکستان کی معیشت میں پاکستانی ثقافت مثبت کردار ادا نہیں کر رہی ہے، کیونکہ یہاں ذہنی رجحانات وہ نہیں ہیں جو کہ سرمایہ دار ممالک کے ہیں۔ صدیوں کی غلامی کی وجہ سے ہم قناعت پسند ہو گئے ہیں حالانکہ ہمارے نبی ﷺ واحد نبی ﷺ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں دنیا میں کامیابی حاصل کی اور دینِ اسلام کو پھیلایا۔ المختصر دین اور دنیا دونوں میں کامیاب رہے اس لیے ضروری ہے کہ ذہنی رجحانات کو درست کیا جائے۔ دانشور، علماء اور طالب علموں کو دین اور دنیا دونوں کی ترقی تبلیغ کریں کیونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔

پاکستانی عوام اربوں روپیہ پان، سگریٹ پر خرچ کر دیتے ہیں یہ دونوں اشیاء امپورٹڈ ہیں ملک کا زرِ مبادلہ غیر ممالک میں منتقل ہو جاتا ہے۔ کروڑوں روپے کا پان پاکستانی، ہندوستان سے خریدتے ہیں، پان صرف دولت کو نقصان ہی نہیں پہنچاتا بلکہ صحت کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ دانتوں کو خراب کر دیتا ہے، ماؤتھ السر پیدا کرتا ہے علاوہ ازیں سگریٹ جو صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے پاکستانی عوام اس پر اربوں روپے کا زرِ مبادلہ ضائع کر دیتی ہے۔ کینسر اور سانس کی بیماریاں سگریٹ نوشی کے ذریعے سے ہی پھیلتی ہیں۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونکس میڈیا پر پان کھانے، سگریٹ نوشی کی خرابیوں پر بحث ہونی چاہیے تاکہ پاکستان کا اربوں روپے کا زرِ مبادلہ بچایا جا سکے۔

کوکا کولا اور پیپسی کولا کارپوریشن نے بہت کوشش کی ہے کہ وہ چائنہ میں چائنہ کے مشروبات یعنی سوڈا واٹر، گرین ٹی وغیرہ کو ختم کر دیں اور اپنے مشروبات کو فروغ دیں لیکن ابھی تک انھیں وہ کامیابی نہیں ہوئی جو انھیں پاکستان میں ہوئی۔ پاکستان میں لوگوں نے

قومی مشروبات یعنی شربت، سردائی، سوڈا واٹر، لیمن بوتل کا استعمال بہت کم کر دیا ہے۔ مہمان کو سب سے پہلے پیپسی کولا یا کوکا کولا پیش کی جاتی ہے حالانکہ کوکا کولا اور پیپسی کولا کی بوتل کے مقابلہ میں فروٹ، فروٹ جوس صحت کے لیے بہت بہتر ہے، اس سے مہمان نوازی ہونی چاہیے۔ غیر ممالک کے مشروبات ہماری ثقافت کا حصہ بن گئے ہیں اس طرح پاکستانی اربوں روپیہ غیر ملکی مشروبات پر خرچ ہو جاتا ہے کیونکہ کوکا کولا اور پیپسی کولا ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں۔

زیورات پہننا پاکستانی عورتوں کی زندگی کا ایک لازمی حصہ بن گیا ہے۔ سونے کی امپورٹ پر اربوں روپے کا زرمبادلہ خرچ ہوتا ہے، زیورات کو پہننے کا رواج برِصغیر میں سب سے زیادہ ہے سرمایہ دار ممالک کی عورتیں سونے کا استعمال نہیں کرتی ہیں۔ پاکستانی لڑکی کا شادی کا بجٹ بناتے وقت سونے کے زیورات کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ سونا پہننا پاکستانی عورت کی نفسیات کا حصہ بن گیا ہے، سونے کے زیورات کو عورتیں اپنے پاس حفاظت سے اس لیے بھی رکھتی ہیں تا کہ وہ مشکل کے وقت اس کو فروخت کر سکیں حالانکہ اگر کوئی عورت پانچ سال تک بینک میں پاکستانی رقم رکھے تو وہ ڈبل ہو جائے گی لیکن اگر وہ زیورات پانچ سال کے بعد فروخت کرنے جائے گی تو اسے وہی قیمت ملے گی جس پر اس نے زیورات کو خریدا تھا، یعنی سونے کے زیورات کی قدر کم ہو جائے گی۔ پاکستانی عورتوں کو گائیڈ کرنے کی ضرورت ہے کہ ترقی یافتہ ممالک عورتیں سونے کے زیورات نہیں پہنتی ہیں اس سے ملکی معاشی ترقی پر منفی اثرات ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے انجینئر سونے کو کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور سپیس انڈسٹری میں استعمال کرتے ہیں جو ان کو معاشی ترقی میں مدد دیتا ہے۔

ہمارے محنت کش اپنی آمدنی کا زیادہ تر حصہ فضول معاشرتی رسوم پر خرچ کر دیتے ہیں۔ موت پر چالیس دن تک سوگ منایا جاتا ہے، ہزاروں روپے خرچ کیے جاتے ہیں، گھر کے افراد اپنے کاروبار کو مناسب توجہ نہیں دیتے۔ لوگ جسمانی کام کرنے سے کتراتے ہیں کیوں کہ ان میں ابھی محنت کے وقار کی سمجھ بوجھ پیدا نہیں ہوئی ہے۔ ذات پات کے بندھن معاشی ترقی میں رکاوٹ ہیں، زمین سے بے پناہ لگاؤ کی وجہ سے صنعتی ترقی رک گئی ہے، گاؤں کا امیر آدمی جس کے پاس زائد دولت ہوتی ہے وہ فیکٹری لگانے کی بجائے زمین

خرید لیتا ہے۔ یہ رجحانات اور رسومات منفی ہیں، انھیں دور کرنے کی ضروت ہے۔

جب سے پاکستان بنا ہے، پاکستان میں سیاسی عدم استحکام ہے، اسی عدم استحکام کی وجہ سے پاکستانی سرمایہ دار اپنا سرمایہ باہر منتقل کر لیتے ہیں۔ اس وقت پاکستانی سرمایہ داروں کا کھربوں روپیہ غیر ممالک کے بینک میں جمع ہے۔ خارجہ پالیسی اتنی اچھی نہیں جتنی ہونی چاہئے۔ سیاسی استحکام مستقل سیاسی پالیسیاں، معاشی ترقی کے لیے بہت ضروری ہیں خدا کرے پاکستان کے سیاسی لوگوں میں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہو جائے اور ملک معاشی ترقی کرے۔

معاشی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہم فضول رسومات کو ختم کر دیں۔ مقدمہ بازی، فرقہ وارانہ دہشت گردی، ذات پات کی بنیاد پر عزت جیسی رسومات کو ترک کر دیں، پان کھانا، سگریٹ نوشی، زیورات پہننا، غیر ملکی مشروبات کے استعمال کے نقصانات پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونکس میڈیا کے ذریعے عوام تک پہنچائیں اس سے کھربوں روپے کی بچت ہوگی، ملکی مصنوعات کو فروغ دیں کیونکہ ایک آدمی کا خرچہ دوسرے آدمی کی آمدنی ہے۔ سرمایہ دار ممالک اسی بات پر عمل کرتے ہیں وہ ملکی اشیاء اور مشروبات کو استعمال کرتے ہیں، غیر ضروری رسومات سے پرہیز کرتے ہیں، فضول رسومات سے پاکستان اتنی دیر تک نہیں بچ سکتا جتنی دیر تک یہاں 100 فیصد سائنسی تعلیم نہ ہو جائے۔ معاشی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہر ڈویژن میں ایک سائنسی لیبارٹری کھولی جائے جو غیر ممالک کی انڈسٹریل گڈز کا سائنسی تجزیہ فراہم کرے۔ ہر سول ڈویژن میں مخصوص انڈسٹری ہے اس مخصوص انڈسٹری کے متعلقہ ٹیکنالوجی کے سکول و کالجز بنائیں جائیں۔ سائنسی تعلیم ہی کی بنیاد پر یورپ اور امریکہ ہم سے آگے ہیں وگرنہ اسلامی ممالک میں وسائل کی کمی نہیں ہے۔ سائنسی تعلیم ہی تمام بیماریوں کا علاج ہے، یہ تعلیم ثقافتی انقلاب برپا کر دے گی، اس سے معیشت، سیاست، ادب غرضیکہ ہر شعبہ ہائے زندگی ترقی کرے گا۔ سالانہ بجٹ میں سائنسی تعلیم کا حصہ زیادہ سے زیادہ رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ جاپان نے معاشی ترقی سائنسی تعلیم ہی کی بنیاد پر کی ہے وگرنہ اس کے پاس قدرتی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں۔

افراطِ زر، مہنگائی اور کرنسی ڈی ویلیوایشن

دوسری جنگِ عظیم کے بعد افراطِ زر کی ٹرم کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے زیادہ تر انٹرنیشنل تجارت بارٹر سسٹم کے تحت یا سونے چاندی جیسے دھاتی زر کی صورت میں ہوتی تھی۔ قیمتوں میں معمولی کمی بیشی ہوتی تھی جو صرف پیداوار کی کمی بیشی کی بنیاد پر ہوتی تھی جو کہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ حاکمِ وقت جو قیمت اپنے ملک میں جنس کی مقرر کر دیتا اس سے زیادہ تاجر اور سوداگر وصول نہیں کر سکتے تھے۔ یورپین ماہر معیشت دان افراطِ زر کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ جب کسی ملک میں زر کی رسد، زر کی طلب کے مقابلہ سے زیادہ بڑھ جائے تو وہاں افراطِ زر پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے زر کی قدر کم ہو جاتی ہے اور اشیاء کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں یعنی افراطِ زر کے اثرات میں اشیاء کی قیمتوں کا مسلسل بڑھ جانا بہت ضروری ہے، افراطِ زر کی تین اقسام ہیں:

1- رینگنے والا افراطِ زر

2- دھیمی چال والا افراطِ زر

3- سرپٹ دوڑنے والا افراطِ زر

افراطِ زر کی دو وجوہات ہیں۔

(1) قومی وجوہات (2) عالمی وجوہات۔

قومی وجوہات درج ذیل ہیں۔

1- زر کی رسد میں اضافہ 2- پیداوار میں کمی

3- آبادی میں اضافہ 4- فیشن و عادات میں تبدیلی

5- اخراجات میں اضافہ 6- جنگی اخراجات

7- ذخیرہ اندوزی 8- بینک لون کی شرح

9- خسارہ بجٹ

یورپین معیشت دانوں کے بقول پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک میں زر کی رسد میں پیداوار کی نسبت زیادہ اضافہ ہوا جس سے زر کی قدر کم ہوگئی اور یوں اشیاء کی قیمتیں چڑھ گئی اسی طرح آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے آبادی بڑھنے سے پیداوار کم ہوگئی ہے ۔ٹیلی ویژن، ویڈیو، ڈش انٹینا، انٹرنیٹ کی وجہ سے انٹرنیشنل کلچر کو فروغ ہو رہا ہے۔ فیشن اور عادات میں تبدیلی ہو رہی ہے، اخراجات بڑھ رہے ہیں اس سے زر کی گردش بڑھ گئی ہے اور افراطِ زر کو فروغ ہو رہا ہے۔ جب سے پاکستان بنا ہے پاکستان حالتِ جنگ میں ہے۔ پاکستان نے اپنے وسائل کو افغانستان جنگ میں خرچ کیا ہے اب بھی سیاچن اور کشمیر میں پاکستان اور انڈیا کے درمیان پراکسی وار جاری ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے ذخیرہ اندوز بھی افراطِ زر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں یہ ضرورت کے وقت اشیاء کو ذخیرہ کر لیتے ہیں اور مارکیٹ میں مہنگے داموں فروخت کرتے ہین اسی طرح بینک لون کی شرح بھی افراطِ زر میں اضافہ کرتی ہے جتنی زیادہ شرہ سود ہوگی اتنا ہی زیادہ افراطِ زر ہوگا کیونکہ شرح سود کے ساتھ صنعت کار اپنا منافع بھی سود میں جمع کرے گا اس طرح قیمتوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک میں اکثر خسارہ کا بجٹ پیش کیا جاتا ہے یعنی قومی آمدنی کی نسبت قومی اخراجات زیادہ کیے جاتے ہیں یہ اخراجات زیادہ تر غیر پیداواری ہوتے ہیں اسی طرح حکومتِ وقت بینک سے قرض لے لیتی ہے اور بھاری شرح سود پر واپس کرتی ہیں۔ مارکیٹ میں اس کے اثرات اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کی صورت میں نکلتے ہیں۔

میرے نزدیک افراطِ زر کی 75 فیصد وجوہات عالمی وجوہات ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

(1) ون یونٹ کرنسی ویلیو

(2) ملٹی نیشنل کمپنیاں

(3) امپورٹڈ گڈز

(4) یوٹیلیٹیز

اگر ان عالمی وجوہات پر کنٹرول کر لیا جائے تو افراطِ زر پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ان

عالمی وجوہات میں سب سے زیادہ کردار ون یونٹ کرنسی کی ڈی ویلیوایشن کا ہے جس کی تفصیل ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قیمت میں کمی جو 1947ء تا 2005ء تک ہوئی ہے۔ گوشواروں کی صورت میں درج ذیل ہے۔

سال	ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قیمت
1947-55ء	3.08
1955-72ء	4.76
1972-73ء	8.90
1973-74ء	9.90
1987-88ء	17.60
1990-91ء	24.65
1993-94ء	30.16
1995-96ء	35.27
1996-97ء	40.48
1997ء	44.09
1998ء انٹر بنک ریٹ	50.00
1999-2000ء	51.77
2000-01ء	58.43
2001-05ء	60.00

☆1947-55ء ایک ڈالر کے مقابلہ میں روپے کی قیمت=3.08 روپے

☆2005ء ایک ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قیمت 60.00=روپے

کرنسی ڈی ویلیوایشن کی وجہ سے 6000 فیصد افراط زر امپورٹڈ اشیاء میں جیسے کہ سونا، تیل، میڈیسن، آرمز اینڈ ایمونیشن، میٹل اور کیمیکل وغیرہ وغیرہ۔

سرمایہ دار ممالک کے مفادات کا تحفظ کرنے والا ادارہ آئی ایم ایف مختلف ممالک کی ون یونٹ کرنسی ویلیوایشن کرتا ہے پاکستان بننے کے بعد اس ادارہ نے امریکن ایک ڈالر کے مقابلہ میں 3.08 روپے قیمت مقرر کی اور ظاہر اصول یہ رکھا کہ جس کے پاس جتنے زیادہ وسائل ہوں گے اس کی کرنسی کی ون یونٹ ویلیو اتنی ہی زیادہ ہوگی اور جس کے پاس وسائل کم ہوں گے اس کی ویلیو اتنی ہی کم ہوگی لیکن یہ اصول ایرانی کرنسی کے بارے میں آئی ایم ایف نے نہیں اپنایا غرض ون یونٹ کرنسی کی قدر کا تعین کرنے میں آئی ایم ایف کے پاس لامحدود اختیارات ہیں۔

بے شک پاکستان کی پیداوار بڑھتی گئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ کرنسی کی ڈی ویلیوایشن ہوگئی جس کی وجہ سے مثبت نتیجہ نہ نکلا پاکستان میں فوڈ انڈسٹری اور فرنیچر انڈسٹری کے علاوہ کوئی انڈسٹری نہیں ہے جس میں امپورٹڈ خام مال یا مشینری استعمال نہیں ہوتی ہے جب کرنسی ڈی ویلیو ہو جاتی تو امپورٹڈ اشیاء کی قدر و قیمت بھی فوراً بڑھ جاتی ہے۔ پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک میں تو افراطِ زر ہو جاتا ہے جبکہ امیر ممالک افراطِ زر سے محفوظ ہو جاتے ہیں اس طرح ترقی پذیر ممالک کرنسی ڈی ویلیوایشن کی وجہ سے غریب سے غریب تر اور امیر ممالک امیر سے امیر تر ہو رہے ہیں۔ یہی حساب ترقی پذیر ممالک کے اندر ہوتا ہے جب کرنسی کی ڈی ویلیوایشن ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ افراطِ زر اور اشیاء کی قیمتوں کا بڑھنے کی صورت میں نکلتا ہے۔ تنخواہ دار طبقہ غریب سے غریب تر اور کاروباری طبقہ امیر سے امیر تر ہو جاتا ہے۔ غیر مساوی تقسیم دولت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا گوشواروں سے ظاہر ہے کہ پاکستان میں 1947ء سے لے کر 2005ء تک ون یونٹ کرنسی کی ڈی ویلیوایشن 6000 فیصد کم ہوئی ہے اور اسی نسبت سے امپورٹڈ اشیاء سونا، میڈیسن، بیس میٹل، تیل، آرمز اینڈ ایمونیشن، کیمیکلز، الیکٹرونکس گڈز اور پیٹرو کیمیکلز وغیرہ وغیرہ کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔

سرمایہ دار ممالک کے معیشت دان کہتے ہیں کہ افراطِ زر تب ہوتا ہے جب زر کی رس بڑھ جاتی ہے پیداوار کی نسبت نتیجتاً اشیاء کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں جو کہ غلط ہے۔ پاکستانی

سرمایہ داروں کا کھربوں روپیہ سرمایہ دار ممالک کے بینکوں میں ہر سال منتقل ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی پاکستان میں افراطِ زر بڑھتا ہی جا رہا ہے کیوں اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی اصل وجہ ون یونٹ کرنسی کی ڈی ویلیوایشن ہے جس کی وجہ سے امپورٹڈ اشیاء کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ پاکستان کے اندر اسی طرح ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی اپنی اشیاء کی قیمتیں بڑھا لیتی ہیں۔ پاکستانی قرضہ بھی کرنسی ڈی ویلیوایشن کی وجہ سے بڑھ جاتا ہے جبکہ ایکسپورٹ گڈز کی قیمتیں فارن کرنسی یا سرمایہ دار ممالک کی کرنسی جیسے کہ ڈالر اور پاؤنڈ وغیرہ کی قیمتیں تبدیل نہیں ہوتی ہیں۔ آج سے پچاس سال پہلے جو فٹ بال اور چاول کی قیمتیں تھی اب بھی وہی ہیں فارن کرنسی میں، یوٹیلیٹی کی قیمت بھی افراطِ زر اور مہنگائی میں اہم کردار ادا کرتی ہے، ہر سال پیٹرول، بجلی، گیس اور ٹیلی فون کے اخراجات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یوٹیلیٹیز (Utilities) کی لاگت صنعت کار اپنی اشیاء میں شامل کر لیتا ہے اس وجہ سے مہنگائی ہو جاتی ہے۔ یوٹیلیٹیز پر بھی ملٹی نیشنل کمپنیاں کنٹرول کر رہی ہیں۔ مندرجہ بالا وجوہات کی وجہ سے پاکستان کا توازن ادائیگی بہتر نہیں ہو رہا ہے۔

پاکستان کی معاشی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ افراطِ زر کو روکا جائے یہ تب ہی ممکن ہے کہ اگر ہم مندرجہ ذیل اقدامات کریں:

1- سرکاری اخراجات میں کمی

2- راشن بندی کے ذریعے قیمتوں پر کنٹرول

3- سائنسی تعلیم کو فروغ دینا تاکہ ملکی مصنوعات کو زیادہ بہتر بنایا جا سکے اور نئی نئی ایجادات ہو سکیں

4- ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مقابلہ میں نیشنل کمپنیوں کو ترقی دینا

مندرجہ بالا اقدامات تو قومی سطح پر کرنے چاہئے، عالمی سطح پر جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ کرنسی کی ڈی ویلیوایشن ہی افراطِ زر کی اہم وجہ ہے۔ افراطِ زر کو روکنا بہت ضروری ہے یہ اسی صورت میں رُک سکتا ہے اگر عالمی تجارت سونے یا چاندی جیسے دھاتی زر میں ہو۔ اس طرح نہ تو کرنسی کی ڈی ویلیوایشن ہو گی اور نہ ہی قیمتیں بڑھیں گی۔ باہر کے ممالک سے کم اَز

کم گڈز کی امپورٹ کی جائے ،امپورٹڈ گڈز پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگایا جائے اور ملکی مصنوعات کی کوالٹی بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان میں سائنسی تعلیم کو فروغ دیا جائے کیونکہ انسانی دماغ ہی وسائل پیدا کرتا ہے۔اسی دماغ نے موجودہ صدی کا سب سے بڑا عجوبہ کمپیوٹر ایجاد کیا ہے اور اسی دماغ کی وجہ سے انسان نے اسلحہ بنایا اور درندوں کو کنٹرول کیا ہے۔بے شک پاکستان میں وسائل کی کمی نہیں صرف میرٹ اور اچھے سسٹم کی کمی ہے۔

بینک اور بینک فراڈ

عہدِ قدیم میں جان و مال کی حفاظت کا انتظام ناکافی تھا، وہ لوگ جو صاحبِ ثروت تھے یا کسی نہ کسی صورت میں روپیہ بچاتے تھے ہمیشہ اس خوف کا شکار رہتے تھے کہ ان کی مال و دولت چھن نہ جائے، چنانچہ ایسے لوگ اپنا مال و دولت اُن افراد کے پاس جمع کرواتے تھے جو بااثر اور طاقتور سمجھے جاتے تھے اور مال و دولت کی بخوبی حفاظت کر سکتے تھے۔ رقوم جمع کروانے والے لوگ ایسے محافظوں کو اپنی مال و دولت کی نگرانی اور حفاظت کے لیے کچھ ادائیگی کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب قانون کی بالادستی قائم ہوگئی تو وہ لوگ جن کے پاس رقوم جمع کروائی جاتی تھیں نے جمع شدہ رقوم کو دوسرے لوگوں کو قرض پر دینا شروع کر دیا اس کے عوض وہ قرض لینے والے لوگوں سے سود وصول کرتے تھے، بینک کے ارتقاء کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دور کے بینک کے تین پیش رو ہیں۔

1- مہاجن
2- سوداگر
3- زرگر

موجودہ دور کے بینک اپنے تینوں پیشروؤں کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ مہاجنوں کی طرح جن افراد کے پاس فالتو روپیہ ہوتا ہے ان سے روپیہ حاصل کر کے دوسرے افراد کو قرض پر دیتے ہیں، سوداگروں کی طرح ادائیگی کے لیے ڈرافٹ اور بدیشی ہنڈیاں وغیرہ جاری کرتے ہیں، امپورٹ ایکسپورٹ میں بھی بھرپور مدد کرتے ہیں، زرگروں کی طرح موجودہ بینک زرِ اعتبار کی تخلیق کرتے ہیں۔ مختصراً ہم آج کے بینک کی تعرف ان الفاظ میں کر سکتے ہیں کہ بینک لوگوں سے وصولیاں کر کے قرضے جاری کرتا ہے، بینک لوگوں سے ڈیمانڈ ڈیپازٹ، کرنٹ اکاؤنٹ اور فکسڈ اکاؤنٹ کی صورت میں جمع کرتا ہے، بینک ان

رقوم کو آجروں، کاروباری افراد کو قرض پر دیتا ہے اور ان سے سود/منافع وصول کرتا ہے، بینکوں کو ان کے کام کی نوعیت اور فرائض کے اعتبار سے مختلف اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1- مرکزی بینک
2- صنعتی بینک
3- تجارتی بینک
4- زرعی بینک
5- ایکسچینج بینک
6- سیونگ بینک
7- کواپریٹو بینک

یورپ میں سولہویں اور سترھویں صدی میں جائنٹ سٹاک کمپنیاں قائم ہوئیں اسی دور میں بینک کا ارتقاء ہوا۔ پہلا مرکزی بینک، بینک آف انگلینڈ تھا یہ مرکزی بینک 1694ء میں قائم ہوا اسے پارلیمنٹ کے ایک قانون کے تحت نوٹ جاری کرنے کے اختیارات دیئے گئے بعدازاں اسے حکومت کا بینک تسلیم کرلیا گیا اس طرح آہستہ آہستہ اسے بہت سے اختیارات سونپ دیئے گے۔ فرانس میں پہلا مرکزی بینک 1800ء میں قائم کیا گیا، 1800ء ہی میں بینک آف روس قائم ہوا، 1914ء میں بینک آف نیدرلینڈ قائم ہوا، پاکستان میں مرکزی بینک یعنی سٹیٹ بینک آف پاکستان یکم جولائی 1948ء میں قائم ہوا۔

اگر پچھلے دس سالہ دورِ بینکنگ کا مطالعہ کریں تو ہمیں فنانس کمپنیوں اور فاریکس کمپنیوں کا فراڈ نظر آتا ہے جو کہ ان کمپنیوں نے بینک اکاؤنٹ ہولڈروں کے ساتھ کیا ہے۔ یہ فنانس کمپنیاں اکاؤنٹ ہولڈروں کو بھاری منافع دیتی تھی جس کی وجہ سے بہت سے پنشنروں نے بھی اپنی پنشن ان فنانس کمپنیوں میں جمع کروادی اور ماہانہ منافع / سود وصول کرنے لگے بعدازاں جب ان کمپنیوں کا آڈٹ کیا گیا تو پتا چلا کہ ان کمپنیوں کے پاس تو اصل رقم ہی نہیں فنانس کمپنیاں بند ہوگئیں، اکاؤنٹ ہولڈر جو کہ زیادہ تر پنشنر یا غیر کاروباری لوگ تھے ان کی رقم ڈوب گئی، اس طرح پاکستانی بینکنگ کے نظام کو ایک جھٹکا لگا آج تک بہت سے اکاؤنٹ ہولڈروں کو رقم واپس نہیں ملی کیونکہ ان فنانس کمپنیوں کے ظاہری مالکان کے پیچھے اصل مالکان بہت طاقتور تھے۔

پاکستانی بینکنگ میں ایک بہت بڑا نقص یہ بھی ہے کہ اگر اکاؤنٹ ہولڈر اپنی رقم پاکستانی روپے میں بینک میں جمع کرواتا ہے تو اسے یہ بھی بتانا پڑتا ہے کہ یہ رقم کہاں سے آئی ہے علاوہ ازیں اس پر انکم ٹیکس، زکوٰۃ اور دوسرے ٹیکس دینا پڑتے ہیں جبکہ اگر وہ اپنی رقم کو فارن کرنسی میں جمع کرواتا ہے تو اس کی رقم خود بخود وائٹ ہو جاتی ہے اس پر زکوٰۃ لاگو نہیں ہوتی اس طرح اپنے ہی ملک یعنی پاکستانی کرنسی پاکستان میں ہی کوئی اہمیت نہیں رکھتی جو کہ ایک بہت بڑا نقص ہے جسے دور کرنے کی ضرورت ہے۔

پاکستانی بینک کے مقابلہ میں فارن کرنسی ایکسچینجر کو زیادہ سہولتیں دی گئی ہیں، مثلاً پاکستانی بینک منافع پر 10 فیصد ایڈوانس ٹیکس کی کٹوتی، شارٹ ٹرم ڈیپازٹ، ڈرافٹ، سی ڈی آر پر 0.20 شرح سے ڈیوٹی کی بندش ہے جبکہ اگر آپ ہنڈی کے ذریعے رقم منگوالیں تو اس پر کوئی ٹیکس دینا نہیں پڑتا ہے، ٹیکس دینے سے بچنے کے لیے اکاؤنٹ ہولڈر اپنی رقم کو فارن کرنسی ایکسچینجر سے منگوانے کو ترجیح دیتے ہیں جو کہ صرف غلط سسٹم کی وجہ سے ہے سرمایہ دار فیکٹریاں لگانے کی بجائے فارن کرنسی میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں جس کی وجہ سے صنعت کاری کو نقصان ہو رہا ہے۔ ٹیکنالوجی کی ترقی رُک گئی ہے، بیروزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے جو کہ انتہائی خطرناک عمل ہے۔

اگر رقم کو محفوظ حالت میں رکھنے کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فارن بینک میں رقم زیادہ محفوظ حالت میں رہتی ہے۔ اہم پاکستانی شخصیات اپنی رقم کو غیر ملکی بینک میں جمع کروانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہاں حکومت جب چاہے رقم چیک کر سکتی ہے اور آمدنی کا ذریعہ پوچھ سکتی ہے، پاکستانی کرنسی اور فارن کرنسی کو فریز کر سکتی ہے، کالی دولت کو پاکستانی سرمایہ دار غیر ملکی بینکوں میں جمع کرواتے ہیں تاکہ محفوظ رہے۔ یہی کالی دولت آئی ایم ایف، ترقی پذیر ممالک کو قرضہ کی صورت میں دے دیتا ہے اور ڈبل فائدہ حاصل کرتا ہے، یہ سسٹم تقریباً تمام ترقی پذیر ممالک میں ہے اس لیے ڈرگ ڈیلرز، بیوروکریسی، سیاستدان اور سرمایہ دار جو کہ کرپٹ ہیں اپنی رقم کو غیر ملکی بینک میں جمع کروانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بے شک ہمارے ملک میں ابھی اچھے سیاستدانوں اور محبِ وطن سرکاری افسروں کی کمی نہیں ہے۔

اب ایک نئی بینکنگ وار(Banking War) شروع ہو چکی ہے بینکوں نے پاکستان میں کروڑ پتی سکیمیں متعارف کروانا شروع کردی ہیں جو کہ ایک منفی رجحان ہے جسے ختم کرنے کی ضرورت ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں نے سیونگ سنٹرز میں رقم جمع کروانے کی بجائے بینک میں رقم جمع کروا رہے ہیں اور بانڈ وغیرہ خریدنے کی بجائے بینک کو ترجیح دے رہے ہیں کیونکہ بانڈ کی نسبت کروڑ پتی سکیم زیادہ چارمنگ ہے۔ نتیجتاً ہر بینک کے اخراجات میں اضافہ ہوگیا ہے، لون کی شرح سود میں زیادہ ہوگیا ہے جس کی وجہ سے افراطِ زر میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اگرچہ بینک نے لوگوں کے ساتھ ناانصافی کی ہے اور پاکستانی بینکنگ سسٹم میں بہت سی خرابیاں ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ لون لینے والوں میں بھی بہت سی خامیاں ہیں جو کہ درج ذیل ہیں۔

بینکوں پر الزام ہے کہ بینکوں نے لون کا 70 فیصد حصہ شوگر مل مالکان اور ٹیکسٹائل ملک مالکان کو دیا ہے یہ سب اہم شخصیات کی فیکٹریاں ہیں جو بہت کم اِنکم ٹیکس دیتی ہیں اور منافع غیر ملکی بینکوں میں جمع کرواتی ہیں، بعض تو خود کو دیوالیہ بھی کر لیتی ہیں جس کی وجہ سے بینکوں کو کافی نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ بے شک بینکوں کو جاپان کی طرح چھوٹی اور گھریلو انڈسٹری کو ترقی دینی چاہیے صنعت کاروں کو بھی خیال رکھنا چاہیے جو وہ لون لیتے ہیں وہ ایمانداری سے واپس کریں اور بینک کے ساتھ فراڈ نہ کریں ہوم اینڈ کاٹیج انڈسٹری کی بنیاد پر ہی جاپان نے بڑی طاقتوں کا سامنا کیا ہے ورنہ اس کا حشر بھی ملائیشیا جیسا ہونا تھا۔

حبیب بینک نے عام آدمی کے لیے ییلو کیب سکیم شروع کی جو کہ زیادہ تر مڈل کلاس کو دی گئی تا کہ بیروزگاری میں کمی ہو لیکن اس کے منفی اثرات ہوئے اکثریت لوگوں نے ییلو کیب کا لون بمعہ سود واپس نہیں کیا اس وجہ سے بینکوں کا مڈل کلاس کو لون دینے کا رجحان کی حوصلہ شکنی ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے بینک کے ساتھ فراڈ کیا ہے جبکہ ان کو تعاون کرنا چاہیے تھا تا کہ مڈل کلاس پر بینک کا اعتماد بنے اور اس کلاس کو زیادہ سے زیادہ بینک لون دے۔

بینکنگ کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ بینک کو اچھا سسٹم دیا جائے مندرجہ بالا خامیاں دور کی جائیں اور فراڈ کو روکا جائے سٹیٹ بینک کی زیر قیادت ایک فعال آڈٹ سیل ہو جو کہ اچھے سسٹم کے لیے آڈٹ کے علاوہ اچھے مشورے بھی دے۔ بینک کی غلط پالیسیوں کو سامنے لائے، جن بینک آفیسروں نے غلط صنعت کاروں کو لون دیئے ہیں ان افسروں کے نام اور صنعت کاروں کے نام عوام کے سامنے لائے تا کہ بدعنوانی کا خاتمہ ہو اور پاکستانی بینک پر عوام کا اعتماد بحال ہو کیونکہ غیر ملکی جرائد اور اخبارات کی خبروں کے مطابق اس وقت اہم پاکستانی شخصیات کی اربوں ڈالرز کی رقم ترقی یافتہ ممالک کے بینک لاکرز اور بینک اکاؤنٹ میں محفوظ ہے۔ بے شک اچھے نظام اور بینک گارنٹی کی بنیاد پر یہ رقم واپس آ سکتی ہے اور سرمایہ کاری میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ بیروزگاری دور ہو سکتی ہے، اچھا بینکنگ سسٹم معاشی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے، پاکستان میں وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے۔

ترقی پذیر ممالک اور بین الاقوامی تجارتی خسارہ

مختلف ممالک کے درمیان تجارت تو زمانہ قدیم سے چلی آ رہی ہے لیکن منظم بیرونی تجارت کا آغاز 1500ء میں شروع ہوا 1500ء تا 1750ء کے عرصہ تجارت کے دور کو ''دورِ تاجریت'' کہا گیا اسی دور میں یورپی سیاح ہندوستان، افریقہ، ایشیاء، آسٹریلیا اور امریکہ تک پہنچے۔ یورپی ممالک نے اس تاجریت کے دور میں بہت زیادہ منافع کمایا یورپی ممالک کی خوشحالی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا اس دور میں سرمایہ دار طبقہ معرضِ وجود میں آیا اس طبقہ نے تجارتی گروہ کی حیثیت حاصل کر لی اس طرح تجارت پیشہ افراد کو ملک کے معاشی اور سیاسی معاملات میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی اس تاجریت کے دور میں تجارت بارٹر سسٹم کے تحت تھی یا پھر ادائیگی سونے اور چاندی کے سکوں پر مشتمل ہوتی تھی بعدازاں ترقی یافتہ ممالک نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد بین الاقوامی تجارت کاغذی زر کے ذریعے شروع کر دی اس طریقہ تجارت سے آج تک ترقی یافتہ ممالک بھاری منافع کمار ہے ہیں۔

بین الاقوامی تجارت ترقی یافتہ ممالک کی معیشت کے لیے بہت ضروری ہے بلکہ ان کی ترقی کا راز ہی بین الاقوامی تجارت ہے۔ لارڈ کینز نے کلی معاشیات کی تھیوری پیش کی اس کلی معاشیات میں اس نے ''زائد پیداوار'' کے تصور کو زیر بحث لایا اور ترقی یافتہ ممالک کو سمجھایا کہ اگر زائد پیداوار کو ترقی پذیر ممالک میں فروخت نہیں کر سکیں گے تو ان کی معاشی ترقی ختم ہو جائے گی، مثال کے طور پر سوئیزر لینڈ گھڑیاں بنانے والا ملک ہے اس کے اپنے ملک کے اندر ایک سال میں گھڑیوں کی فروخت پانچ لاکھ ہے، سوئیزر لینڈ اگر دس لاکھ گھڑیاں بنالیتا ہے اور گھڑیاں ایکسپورٹ نہیں ہو پاتی، ایک گھڑی کی قیمت 1000 روپیہ ہے، گھڑی کی قیمت 1000 روپیہ سے کم کر کے 700 روپے مقرر کر دی جاتی ہے تا کہ فرم کی تمام گھڑیاں فروخت ہو جائیں اور فرم کو نقصان نہ اُٹھانا پڑے، صارفین سستی گھڑی

ہونے کی وجہ سے پانچ لاکھ گھڑیاں خریدنے کی بجائے 6 لاکھ گھڑیاں خرید لیتے ہیں پھر بھی چار لاکھ گھڑیاں بچ جائیں گی اس طرح فرم کو نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ فرم کچھ ورکروں کو نوکری سے نکال دے گی اور کچھ ورکروں کو سستی تنخواہ پر رکھ لے گی ملک میں بیروزگاری پھیلے گی، صارفین کی قوتِ خرید کم ہو جائے گی، قوتِ خرید میں کمی آنے کی وجہ سے شیطانی معاشی چکر کا آغاز ہو جائے گا اور معاشی ترقی کا عمل رُک جائے گا یعنی زائد پیداوار کو ایکسپورٹ کرنا اور قرضوں کی صورت میں دینا ترقی یافتہ ممالک کی کمزوری اور یہی ان کی ترقی کا راز بھی ہے۔ ایران، سوڈان اور لیبیا پر جو ترقی یافتہ ممالک نے تجارتی پابندیاں لگا رکھی ہیں اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ یہ ممالک اپنی زائد پیداوار کو ضرورت مند ممالک میں ایکسپورٹ نہ کر سکیں اور بیروزگاری کا شکار ہو جائیں۔

ایک ملک جو اشیاء درآمد یا برآمد کرتا ہے اس کا باقاعدہ حساب رکھتا ہے، برآمدات کے بدلے اس ملک کو باہر کے ممالک سے رقوم حاصل ہوتی ہیں اور درآمدات کے بدلے اس ملک کو باہر کے ممالک کو رقوم ادا کرنی پڑتی ہیں۔ کسی ملک کی بین الاقوامی ادائیگیوں اور وصولیوں کے اس ریکارڈ کو توازن ادائیگی کہا جاتا ہے، توازن ادائیگی کا ریکارڈ سالانہ ہوتا ہے اور ہر ملک سالانہ معاشی جائزہ میں توازن ادائیگی کا جائزہ لیتا ہے۔ جب پاکستان کے توازن ادائیگی کا جائزہ لیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ صرف کوریا کی جنگ کے دوران میں اس کا توازن ادائیگی بہتر رہا ہے باقی کبھی بھی اس کا توازن ادائیگی بہتر نہیں رہا، آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کی وصولیاں کم رہتی ہیں اور ادائیگیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ بین الاقوامی تجارت میں ترقی پذیر ممالک کو ہی کیوں نقصان اُٹھانا پڑتا ہے، اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

یورپ کے اکثر ممالک اور جاپان خام مال کی پیداوار میں خود کفیل نہیں بلکہ معیشت دان تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ سے بنیادی اجناس کی برآمد نہ ہو تو یورپ کے ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں اور جاپان کے لوگوں کے پاس نہ تو کھانے کے لیے کچھ ہو اور نہ پکانے کے لیے اور نہ ہی پینے کے لیے کچھ ہو کیونکہ عالمی پیداوار میں

ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کا حصہ بہت زیادہ ہے جو کہ تقریباً مندرجہ ذیل ہے۔

سیریل نمبر	اشیاء	عالمی پیداوار میں حصہ
1	پٹ سن	75%
2	تیل	70%
3	کافی	70%
4	چائے	70%
5	ربر	80%
6	قدرتی گیس	55%
7	چاول	70%
8	کپاس	70%

مندرجہ بالا اشیاء بھی وہ فائدہ نہیں دیتیں جو کہ ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک کو ملنا چاہئے وجہ یہ کہ ہے کہ یورپ اور یو۔ایس۔اے (USA) نے ایک ٹیکنیکل مضبوط معاشی سسٹم بنا رکھا ہے اسی سسٹم کے تحت چاہے کتنی بھی پیداوار ہو فائدہ یورپ اور یو۔ایس۔اے (USA) کو ہی ہوگا یہ سسٹم کچھ ہوں ہے۔

1- پٹ سن، تیل، کافی، چائے، ربر، قدرتی گیس، چاول، کپاس، سرجیکل گڈز، سپورٹس گڈز، لیدر گڈز اور دوسری ہینڈ میڈ گڈز کی قیمتیں کم رکھنا کیونکہ یہ ترقی پذیر ممالک پیدا کرتے ہیں۔

2- ترقی پذیر ممالک کا ایکسپورٹ کوٹہ مقرر کرنا۔

3- ترقی پذیر ممالک کی کرنسی کی قیمت کم رکھنا۔

سرمایہ دار ملکوں کی پیدا کی ہوئی مصنوعات کی قیمتیں گذشتہ 50 سال کے عرصہ میں کئی گنا زیادہ بڑھ گئی ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں ترقی پذیر ممالک کی اشیاء کی قیمتیں بھی کم ہوئی ہیں اور کرنسی کی ویلیو بھی کم ہوئی ہے، علاوہ ازیں سرمایہ دار ممالک ایسی اشیاء بناتے ہیں جو کہ ترقی پذیر

ممالک نہیں بناتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں ان کے پاس ان اشیاء کی ٹیکنالوجی ان سرمایہ دار ملکوں نے پہنچنے نہیں دی ہے۔ سرمایہ دار ممالک مندرجہ ذیل اشیاء بناتے ہیں جن کی قیمتیں وہ جو چاہے لگاتے ہیں اور ان کا کوئی کوٹہ بھی ترقی پذیر ممالک نے مقرر نہیں کیا ہے۔

1- الیکٹرانکس گڈز اور کمپیوٹرز
2- آرمز اور ایمونیشن
3- ہائی کلاس میڈیسن
4- کیمیکل اور پیٹرو کیمیکلز پراڈکٹس
5- جہاز سازی
6- قیمتی گاڑیاں
7- مشینری

مندرجہ بالا اشیاء انسانی دماغ کی تخلیق ہیں نہ کہ یہ اشیاء قدرتی پیداوار کا حصہ ہیں کاغذی زر ہونے کی وجہ سے ترقی پذیر ممالک کی کرنسی کی ویلیو ہر سال کم ہو جاتی ہے اور ترقی پذیر ممالک کا قرضہ کرنسی کی ڈی ویلیوایشن کی وجہ سے بڑھ جاتا ہے۔ اس کے لیے دو طریقہ کار ہیں پہلے نمبر پر یہ کہ بارٹر سسٹم کے تحت تجارت کریں اگر اس طرح ممکن نہیں ہے تو بین الاقوامی تجارت گولڈ کرنسی میں کریں، اس طرح ہر سال کرنسی کی ڈی ویلیوایشن کی وجہ سے جو نقصان ترقی پذیر ممالک کو اُٹھانا پڑتا ہے اس سے وہ محفوظ ہو جائیں گے بے شک فنی تعلیم اور سائنسی تعلیم ہی کی بنیاد پر ترقی یافتہ ممالک نے کمپیوٹر بنایا ہے جو کہ اس صدی کی سب سے بڑی ایجاد ہے۔ پاکستان میں جرنل ایجوکیشن کی بجائے سائنسی تعلیم کو فروغ دینا چاہیے، سائنسی تعلیم کو فروغ ہوگا تو نئی نئی ایجادات ہوں گی، ملک کے اندر نئی نئی اشیاء پیدا ہوں گی، ایکسپورٹ کی ضرورت نہیں رہے گی، توازن ادائیگی بہتر ہو جائے گا، پاکستان خود کفیل ہو جائے گا بے شک پاکستان کا کسان اور کاشت کار ہاڑ کی گرمیاں ہوں یا پوہ کی سردیاں سخت محنت کر کے گذشتہ سال کے مقابلہ میں زیادہ رقبہ زیر کاشت لاتا ہے اور زیادہ پیداوار کرتا ہے صرف بہتر معاشی سسٹم کی ضرورت ہے۔

ایڈ سے ایڈز تک

دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ نے ترقی پذیر ممالک کی معیشت، سیاست اور خارجہ پالیسی وغیرہ وغیرہ کو کنٹرول کرنے کیلئے ایک منصوبہ بنایا یہ منصوبہ ایسا تھا جس کے تحت جنگ کئے بغیر امریکہ نے ترقی پذیر ممالک کے وسائل کو اپنی طرف منتقل کرلیا اس منصوبہ کا خالق امریکی جنرل سیاست دان اور وزیر خارجہ جارج مارشل تھا اس منصوبے کو آج بھی مارشل پلان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس مارشل پلان کے عوض جارج مارشل کو امن کا نوبل انعام دیا گیا ہے یہ ایک معاشی منصوبہ تھا جسے بعد ازاں بیرونی امداد کا نام دیا گیا اس منصوبہ کے تحت ترقی پذیر ممالک کو بیرونی امداد، گرانٹ اور قرضوں کی صورت میں دی گئی بعد ازاں ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف بھی بیرونی امداد دینے لگے آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک میں ترقی یافتہ ممالک شامل ہیں جو کہ ترقی پذیر ممالک کو گرانٹ اور قرضہ دیتے ہیں غرض آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک میں تمام طاقتور ممالک شامل کر گئے تا کہ ترقی پذیر ممالک کے وسائل جنگ لڑے بغیر اپنی طرف منتقل کئے جا سکے۔

اقوام متحدہ نے بیرونی امداد کی تعریف یوں کی ہے:

''بیرونی امداد بیرونی حکومتوں اور بین الاقوامی تنظیموں سے غیر فوجی مقاصد کیلئے حاصل ہونیوالی گرانٹ اور قرضوں پر مشتمل ہوتی ہے۔''

بیرونی قرضہ کی درج ذیل اقسام ہیں:

1- مشروط قرضہ　　2- غیر مشروط قرضہ

3- نا قابل واپسی قرضہ　　4- قابل واپسی قرضہ

5- دوطرفہ قرضہ　　6- کثیر الطرفہ قرضہ

ترقی پذیر ممالک کو قرضہ زیادہ تر مشروط ملتا ہے نا قابل واپسی قرضہ یا گرانٹ ورلڈ

بنک اور آئی ایم ایف سے نہ ہونے کے برابر ملتی ہے ترقی یافتہ ممالک یا آئی ایم ایف کیلئے قرضہ دینا اسی طرح ضروری ہے جس طرح سے ساہوکار اور بنیئے کے لئے سود کا کاربار کرنا، قرضوں کے کاروبار سے آئی ایم ایف ترقی پذیر ممالک کو اپنی عالمی حکمت علمی کا حصہ بننے پر مجبور کر دیتا ہے چنانچہ ترقی یافتہ ممالک اپنے قرضوں کی شرائط انہی مقاصد کو مدنظر رکھ کر طے کرتے ہیں یہ شرائط کچھ یوں ہوتی ہیں۔

1- قرضوں کا ایک حصہ بطور پہلی قسط کے قرضہ دیتے ہی وصول کرلیا جاتا ہے۔

2- قرضہ کے ذریعے خریدی جانی والی تمام اشیاء صرف قرض خواہ ملک ہی سے خریدی جاسکتی ہیں اس طرح قرض دینے والے ممالک اپنا ناقص مال اور مشینری بھی فروخت کر لیتے ہیں بلکہ قرضوں پر سود کی صورت میں مزید منافع کماتے ہیں۔

3- فنی ماہرین کی صورت ترقی یافتہ ممالک اپنے ناکارہ اور بیروزگار آدمی بھیج دیتے ہیں اس طرح ان کا بیروزگاری کا مسئلہ بھی حل ہوجاتا ہے۔

4- قرضہ کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ قرضہ کی رقم سے خریدے جانے والے تمام مال کا 25 فیصد ترقی یافتہ ممالک کے جہازوں پر آئے گا اس شرط سے ان کے کاروبار میں اضافہ ہوتا ہے۔

5- بیرونی تجارت فارن کرنسی میں ہوگی جیسا کہ پاکستان میں زیادہ تر تجارت ڈالر کرنسی میں ہوتی ہے اس طرح بینک چارجز کمیشن، فریٹ، انشورنس کی ادائیگی بھی ڈالر کی صورت میں ہوتی ہے جس کا فائدہ امریکہ کو ہوتا ہے ترقی پذیر ممالک کی اپنی کرنسی میں تجارت نہیں ہوتی اگر ترقی پذیر ممالک آپس میں تجارت کرتے وقت اپنی اپنی کرنسی میں تجارت کرے تو اس طرح بیرونی امداد لینے کی بھی ضرورت نہ رہے اور کرنسی کی ویلیو بھی کم نہ ہو علاوہ ازیں روزگار میں بھی اضافہ ہو۔

یہ مندرجہ بالا شرائط پر قرضہ تو ترقی یافتہ ممالک جیسے کہ امریکہ، فرانس، جاپان، برطانیہ اور جرمنی وغیرہ دیتے ہیں یہی ممالک جب آئی ایم ایف میں بیٹھ کر ترقی پذیر ممالک کو قرضہ دیتے ہیں تو ان کی شرائط کچھ یوں ہوتی ہیں:

1- قیمتوں میں چھوٹ کا خاتمہ

2- بجلی، پانی، گیس، ٹیلی فون اور ٹرانسپورٹ چارجز میں اضافہ

3- درآمدات پر کسٹم ڈیوٹی میں کمی

4- پرائیوٹائزیشن کو فروغ

5- قیمتوں پر کنٹرول کا خاتمہ

6- انٹرنیشنل کرنسی ایکسچینجرز کے کاروبار کو فروغ

7- روپے کی قدر و قیمت میں کمی

8- ٹریڈ یونین پر کنٹرول

9- اہم ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ آفس میں اپنے نمائندے متعین کرتا۔

ان تمام مندرجہ بالا شرائط کی وجہ سے قرض لینے والے ملک کی معاشی ترقی رک جاتی ہے بیرونی اشیاء کی خرید و فروخت کا فروغ ہوتا ہے نیشنل صنعت کار کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے عوام کی جیب سے جو ٹیکس کی صورت میں نکلتا ہے وہ آئی ایم ایف والے لے جاتے ہیں اسی طرح ترقی پذیر ممالک سیاسی طور پر غلام ہو جاتے ہیں آئی ایم ایف ان کی خارجہ پالیسی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ آخر انڈر ڈویلپنگ ممالک کے وہ کون لوگ ہیں جو کہ قرض حاصل کرنا چاہتے ہیں جنہیں قرضہ حاصل کر کے فائدہ ہوتا ہے یہ 10 ہزار کے قریب لوگ ہیں جو سیاست اور بیوروکریسی میں ہیں کیونکہ قرضہ تو ان ہی لوگوں نے خرچ کرنا ہوتا ہے جب قرضہ کو یہ مندرجہ بالا حکمران غیر ملکی اشیاء کی خرید و فروخت پر خرچ کرتے ہیں تو ان کو باقاعدہ کمیشن ملتا ہے جو کہ یہ غیر ملکی بنکوں کو فارن کرنسی کی صورت میں جمع کروا دیتے ہیں اس طرح دوبارہ رقم ترقی یافتہ ممالک کے پاس چلی جاتی ہے جیسا کہ اخباروں میں بھی آ چکا ہے کہ پاکستان کے افسروں اور سرمایہ داروں کے بیرونی اکاؤنٹ پاکستان کے بجٹ اور قرض سے دوگنا ہیں اس کی ایک مثال یوں ہے کہ میرے علاقہ میں سٹریٹ لائٹ لگوائی گئی ایک فانوس کے بلب بمعہ کور کی قیمت تقریباً 2700 روپے تھی جو کہ امپورٹڈ تھا جبکہ ڈبل ٹیوب لائٹ بمعہ کور کی قیمت مارکیٹ میں 700 تھی ان دونوں کی روشنی برابر تھی اگر علاقہ کا

ایڈمنسٹریٹر لوکل مارکیٹ سے ٹیوب لائٹ بمہ کور خریدتا اور کمیشن لے لیتا تو یہ راز افشا ہو جاتا دوسری طرف کمیشن بھی بہت کم ایڈمنسٹریٹر کا بنتا امپورٹڈ اشیاء کو خریدنے سے نہ تو اس کی قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور نہ ہی کمیشن کا اس کے علاوہ مقامی صنعت کو بھی بہت نقصان ہوتا ہے مقامی اشیاء کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے غیر ملکی کمپنیاں بیوروکریسی کو کمیشن کے علاوہ ان کے بیٹوں کو بیرون ممالک وظائف دیتی ہیں علاوہ ازیں ریٹائرڈ ہونے کے بعد دوبارہ انہیں ملازمتیں عالمی اداروں میں مل جاتی ہیں اور کچھ کو این جی اوز چلانے کے لئے مل جاتی ہیں غرض کمیشن کے لالچ میں بیوروکریسی اور سیاستدان ملکی معیشت کو تباہ کر دیتے ہیں۔

آئی ایم ایف نے کبھی بھی ترقیاتی منصوبے شروع نہیں کروائے۔ ہمیشہ غیر پیداواری سرمایہ کاری شروع کروائی ہے میٹل انڈسٹری، الیکٹرانکس، آرمز اینڈ ایمونیشن انڈسٹری، پٹرولیم انڈسٹری اور فنی اداروں کو کبھی آئی ایم ایف نے قرضہ نہیں دیا کیونکہ آئی ایم ایف میں بیٹھے ہوئے ترقی یافتہ ممالک کے ماہرین سمجھتے ہیں کہ اس طرح سے ترقی پذیر ممالک اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے آئی ایم ایف نے 1951ء میں پاکستانی روپے کی قیمت بمقابلہ ڈالر 3.08 روپے مقرر کی تھی جو کہ اب بڑھ کر 2005ء میں 60 روپے فی ڈالر ہوگئی ہے یہ سب امداد لینے کی وجہ سے ہوا ہے بجٹ کا تقریباً 1/3 حصہ قرضوں کی ادائیگی پر صرف ہو جاتا ہے یہ ایڈ اب ایڈز کی صورت اختیار کر چکی ہے ایڈ کا منصوبہ بھی ترقی یافتہ ممالک نے بنایا تھا اور ایڈز کا مصنوعی وائرس بھی ان ہی ممالک نے تیار کروایا ہے کیونکہ مصری ممیوں پر ایڈز کی بیماری نہیں پائی گئی جب بھی مشکل وقت آتا ہے آئی ایم ایف دھوکا دیتا ہے اس کی تازہ مثال پاکستان کا ایٹمی دھماکہ کرنا ہے اور اس کے نتیجہ میں ڈالر کی قیمت پاکستانی روپے میں 50 روپے تک پہنچی ہے جس کی وجہ سے شدید مہنگائی ہوگئی ہے دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں کرنسی کو کاروبار کی حیثیت نہیں ہے جیسا کہ امریکہ برطانیہ اور جرمنی وغیرہ جبکہ پاکستان میں فارن کرنسی کو ایک کاروبار کی حیثیت ہوگئی ہے سرمایہ دار اپنی دولت کو فارنسی کرنسی کی صورت میں رکھنا پسند کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ 1951ء میں پاکستانی روپے کی قیمت بمقابلہ ڈالر 3.08 روپے تھی جو کہ 2005ء میں بڑھ کر

60روپے بمقابلہ فی امریکن ڈالر ہوگئی ہے یہ کرنسی کے کاروبار نے سرمایہ داروں کی صنعت کاری میں حوصلہ شکنی کی ہے اور بے روزگاری میں اضافہ کیا ہے۔

قرضوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ پاکستان غیر ضروری اخراجات میں کمی کرے تعیشاتی اشیاء کی امپورٹ بین کرے کیونکہ 80 فیصد پاکستانی تو صرف خوراک کپڑا اور سستی ادویات پر گزارہ کرتے ہیں بیرونی امداد سے پہلے یعنی مغلوں کے دور میں بھی تم عام انسان کو روٹی کپڑا اور مکان دستیاب تھا کوئی ایسا واقعہ نہیں کہ عوام اس دور میں قحط سے مرگئی ہو آئی ایم ایف اگر 10 فیصد سالانہ شرح سود پر قرضہ دیتا ہے تو دس فیصد سالانہ ڈی ویلیوایشن بھی کرتا ہے اس طرح سود ادا کرنے کے بعد اصل زر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جتنا پاکستان نے قرضہ لیا اس کا سود ہی ادا کر دیا ہے اور اصل رقم بھی آئی ایم ایف کے پاس پہنچ گئی ہے لیکن روپے کی ڈی ویلیوایشن کی وجہ سے قرضہ کئی گناہ زیادہ ہو گیا ہے پاکستان کو ایسی پوزیشن پر آئی ایم ایف نے پہنچا دیا ہے کہ پاکستان قرضہ نہیں ادا کر سکتا ہے کیونکہ جو قرضہ 1951ء میں 3.08 روپے پاکستانی بمقابلہ فی امریکن ڈالر ملا تھا اب وہ فی امریکن ڈالر بمقابلہ 60 پاکستانی روپے ہو گیا ہے ضرورت ہے کہ ملک میں الیکٹرانکس انڈسٹری و میٹل انڈسٹری، پٹرولیم انڈسٹری جدید آرمز اینڈ ایمونیشن انڈسٹری لگائی جائے کیونکہ یہی مندرجہ بالا اشیاء پاکستان امپورٹ کرتا ہے جس کی وجہ سے توازن ادائیگی غیر موافق ہو جاتا ہے پاکستان میں خوراک کی کوئی کمی نہیں ہے اور موسم کے لحاظ سے یہاں چاروں موسم ہیں قرضہ تو صرف عیاشی کے لئے چند افسر شاہی کے لوگ اور چند سیاست دان ہی ہڑپ کر لیتے ہیں صرف منصوبہ بندی کی ضرورت ہے کرپشن / کمیشن کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے پاکستان میں وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے۔

انسانی وسائل کی منتقلی

کسی بھی ملک کی معاشی ترقی میں انسانی وسائل، قدرتی وسائل، سائنس وٹیکنالوجی اور سرمایہ بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور انہیں ہی کی بنیاد پر ملک معاشی ترقی کرتا ہے ماضی میں طاقتور ممالک جنگ کے ذریعے کمزور ممالک کے وسائل لوٹ لیتے تھے اب ترقی یافتہ ممالک مختلف طریقوں یعنی تجارت، بیرونی امداد، کرنسی کی ون یونٹ قدر زیادہ رکھ کر اور ترقی پذیر ممالک میں ناانصافی اور کرپشن پھیلا کر ان کے وسائل اپنی طرف منتقل کر لیتے ہیں اس وقت میرا موضوع انسانی وسائل کی منتقلی ہے۔

انسانی دماغ وسائل پیدا کرتا ہے اور اسی دماغ کی بنیاد پر انسان طاقتور جانوروں پر بھی حکومت کرتا ہے ذہانت ہی کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان سے بدتر ہو جاتا ہے اس وقت مسلمان ممالک کے پاس 80 فیصد ربر 75 فیصد پٹ سن 60 فیصد تیل اور 40 فیصد قدرتی گیس ہے لیکن ہم پھر بھی یہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں اس کی ایک اہم وجہ برین ڈرین ہے یعنی ترقی پذیر ممالک کا ذہین اور محنتی انسان ترقی یافتہ ممالک میں منتقل ہو جاتا ہے اور اس سے ترقی یافتہ ممالک فائدہ اٹھاتے ہیں علاوہ ازیں ان ممالک نے سائنس کلچر کو بہت کم فروغ دیا ہے ذہین، محنتی اور بہادر انسانوں کی وجہ سے یورپ کے لوگوں نے براعظم افریقہ براعظم آسٹریلیا اور براعظم امریکہ پر قبضہ کیا ہے ہر سال پاکستان سے اور ترقی پذیر ممالک سے ڈاکٹرز، انجینئرز، پروفیسرز اور دوسرے فنی تربیت یافتہ ماہرین ترقی پذیر ممالک میں منتقل ہو جاتے ہیں شروع میں یہ لوگ ملازمت کی غرض سے وہاں جاتے ہیں بعد ازاں یہ مستقل طور پر وہاں آباد ہو جاتے ہیں ماہرین کا دوسرے ممالک میں چلے جانا ایک عظیم قومی نقصان ہے اگر انہیں ایک منظم طریقہ سے برآمد کیا جائے تو پاکستان بہت سا زرمبادلہ کما سکتا ہے اور ملک ترقی کر سکتا ہے انسانی وسائل کی منتقلی کی درج ذیل معاشی سیاسی سماجی اور متفرق وجوہات ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک نے اپنی کرنسی کی ون یونٹ ویلیو ترقی پذیر ممالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ رکھی ہے اس فرق کی وجہ سے پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کے ذہین اور محنتی انسان ترقی یافتہ ممالک میں منتقل ہو جاتے ہیں 2005ء میں فی امریکن ڈالر کی اوپن مارکیٹ میں کم از کم پاکستانی 60 روپے ہے اگر ایک ذہین آدمی امریکہ میں 2000 ڈالر ماہانہ تنخواہ حاصل کرتا ہے تو یہاں پاکستان میں اسکی تنخواہ تقریباً 12,0000 روپے بن جاتی ہے یہ کرنسی کا فرق اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ امریکہ یا دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں منتقل ہو جائے۔

اگر بے روزگاروں کی تعداد کو دیکھا جائے تو پاکستان میں آپ کو زیادہ تر تعلیم یافتہ لوگ بے روزگار نظر آئیں گے تقریباً ہر سرکاری محکمہ میں ڈاؤن سائزنگ کا عمل جاری ہے اس طرح گورنمنٹ میں ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے ذہین آدمی ترقی یافتہ ممالک میں منتقل ہو جاتے ہیں جو بچ جاتے ہیں انہیں ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے ہاں ملازمت پر رکھ لیتی ہے۔اس طرح سرمایہ کاری پاکستان کرتا ہے اور فائدہ ترقی یافتہ ممالک یا ان کی ملٹی نیشنل کمپنیاں اٹھاتی ہیں اور ہم یعنی ذہین آدمی اپنی نوکری کو پکا کرنے کی غرض سے ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کی پروڈکٹس کی تعریفیں کرنی شروع کر تا دیتا ہے۔

پاکستان میں نظام تعلیم بہت ہی خراب ہے یورپ میں قصاب اور کک وغیرہ کو گرایجویٹ کی ڈگری دی جاتی ہے اس کے برعکس پاکستان میں قصاب اور باورچی بننے کا عمل شاگردی جیسے غیر اخلاقی عمل سے شروع ہوتا ہے پاکستان میں جو تعلیم عام ہے وہ زیادہ تر جنرل ایجوکیشن پر مشتمل ہے یعنی غلط قسم کی مہارت پیدا کی جاتی ہے ضروری ہے کہ سکول وکالج میں ایک ٹیکنیکل سبجیکٹ بھی رکھا جائے تا کہ تعلیم یافتہ لوگ صرف کلرک نہ بنیں بلکہ اچھے ڈرائیور، موٹر مکینک ، کار مکینک ، قصاب اور باورچی وغیرہ بن کر اپنا روزگار کما سکیں یہاں جب ایک طالب علم ایم اے کر لیتا ہے تو اسے ملازمت نہیں ملتی تو وہ ترقی یافتہ ممالک میں منتقل ہو جاتا ہے وہاں وہ مزدوری تک کرنی شروع کر دیتا ہے۔

ترقی یافتہ ممالک نے ترقی پذیر ممالک کے اندر ایک منصوبہ بندی کے تحت سیاسی عدم استحکام پھیلا رکھا ہے ہر وقت ترقی پذیر ممالک میں رہنے والے عوام محسوس کرتے ہیں پتہ نہیں یہ ملک رہے گا

یانہیں رہے گا کونسی سیاسی پارٹی برسر اقتدار آئے گی کونسی سیاسی پارٹی برسر اقتدار نہیں آئے گی اس سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے بھی برین ڈرین ہوجاتا ہے علاوہ ازیں ملازمتوں میں بہت زیادہ سیاسی اثر ورسوخ کردار ادا کرتا ہے میرٹ ہی کی بنیاد پر ملازمتیں نہیں ملتی بلکہ سیاسی وابستگی کی بنیاد پر ملازمتیں ملتی ہیں اس طرح ایک ذہین اور محنتی شخص ملک چھوڑنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

پاکستان میں اکثریت لوگ ایڈمنسٹریٹر بننا چاہتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ایڈمنسٹریٹر بن کر ان کی زیادہ عزت ہوگی اور وہ زیادہ دولت کمائیں گے ایک ٹیکنیکل آدمی کو یہاں وہ عزت نہیں دی جاتی جو کہ اسے دینی چاہیے ٹیکنیکل آدمی کو نفرت سے لوہار اور باورچی کو نائی کہا جاتا ہے لہذا یہاں کا ٹیکنیکل آدمی مجبور ہو کر ملک چھوڑ دیتا ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں ہر شخص کو مسٹر کہہ کر پکارا جاتا ہے اور ٹیکنیکل افراد کی خاص طور پر زیادہ قدر کی جاتی ہے یہی سماجی فضا ٹیکنیکل افراد کو ترقی یافتہ ممالک میں منتقل ہونے پر اُکساتی ہے۔

بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی ملازمت کے حصول میں جب ایک ذہین اور تربیت یافتہ فرد ناکام ہوجاتا ہے تو وہ ملک چھوڑ کر قوم کو اپنی خدمات سے محروم کر کے اس سے ناکامی کا بدلہ لیتا ہے تعلیمی اخراجات ترقی پذیر ملک اٹھاتا ہے۔ لیکن فائدہ ترقی یافتہ ممالک اٹھاتا ہے اسی طرح بہت سے لوگ اپنی تعلیم کو بہتر بنانے کیلئے بھی ترقی یافتہ ممالک جاتے ہیں اور پھر وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مغرب میں مشرق کی نسبت عیاشی بہت زیادہ آسان اور سستی ہے اس طرح بہت سے نوجوان اپنی جنسی خواہشات کی تسکین کے لئے یا سفید چمڑی والی بیوی حاصل کرنے کیلئے بھی مغرب کا رُخ کرتے ہیں اور پھر وہی کے ہو کر رہ جاتے ہیں پھر جب ان کی بچیاں جوان ہوجاتی ہیں تو پھر وہ رشتوں کی تلاش میں مشرق کا رُخ کرتے ہیں اور یہاں سے محنتی اور تربیت یافتہ افراد کو ترقی یافتہ ممالک میں لے جاتے ہیں اسی طرح ترقی پذیر ممالک سے ترقی یافتہ ممالک کو انسانی وسائل کی منتقلی کا عمل جاری رہتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مندرجہ بالا معاشی، سماجی اور متفرق وجوہات دور کریں اور اندرون ملک روزگار پیدا کریں علاوہ ازیں اگر منظم طریقہ سے انسانی وسائل کو

ترقی یافتہ ممالک میں بھیجا جائے اور پھر دوبارہ انہیں درآمد کرلیا جائے تو ہم بہت زیادہ آمدنی حاصل کرسکتے ہیں انسانی وسائل کی منظم طریقہ کی منتقلی کی سب سے اچھی مثال ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ہے جو بذات خود ہالینڈ گئے اور بعدازاں ذوالفقار علی بھٹو کے کہنے پر پاکستان تشریف لائے اور پاکستان کو ایک اسلامی ایٹمی قوت بنادیا اس کی ایک اور مثال اسرائیل کا قیام ہے منظم طریقہ سے یہودی روس انگلینڈ اور یورپ سے فلسطین منتقل ہوئے اور پھر بغیر جنگ لڑے انہوں نے اسرائیل کی بنیاد رکھ دی یعنی کوئی بھی کام اگر ایک منصوبہ بندی کے تحت کیا جائے تو وہ فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے پاکستان کے اندر بھی انسانی وسائل مس یوز (Misuse) ہورہے ہیں ڈاکٹرز اور انجینئرز پر گورنمنٹ آف پاکستان کی کافی رقم خرچ ہوتی ہے یہ لوگ اپنے پروفیشن کی بجائے سی ایس ایس کررہے ہیں جو نئے سی ایس سی پی آرہے ہیں یہ زیادہ تر ڈاکٹرز اور انجینئرز ہی ہیں ان کا کوٹہ مقرر ہونا چاہیے تاکہ جنرل ایجوکیشن گروپ کو بھی سی ایس ایس کرنے کا موقع ملے ظاہر ہے جو ڈاکٹرز اور انجینئرز آرہے ہیں ان میں زیادہ تر کا مقصد حصول دولت اور حصول اقتدار ہے نہ کہ خدمت خلق اگر ہم اندرون ملک صحیح طریقہ سے منصوبہ بندی کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان ایک ترقی یافتہ ملک نہ بن جائے جس کی مثال جاپان اور جرمنی ہیں جنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک منصوبہ بندی کے تحت کام کیا اور اب وہ سپر پاورز ہیں اس طرح ہمارا ہمسایہ ملک چین کو بھی ایک مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جس کی آبادی دنیا میں سب سے زیادہ ہے وہ اگر اپنی آبادی ایکسپورٹ کرتا ہے تو ایک منظم طریقہ سے اگر سرمایہ کاری کرتا ہے تو ایک منظم طریقہ سے جہاں بھی چائنیز جاتے ہیں وہاں ہی چائنہ ٹاؤن بن جاتا ہے پاکستان کو صرف اچھی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے جب پاکستان میں اچھی منصوبہ بندی ہوجائے تو پاکستان ایک کامیاب ملک بن جائے گا کیونکہ پاکستان میں انسانی وسائل اور قدرتی وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے۔

دولت کی غیر مساوی تقسیم

اکثریت ترقی پذیر ممالک میں غیر مساوی تقسیم دولت ہے کیونکہ زیادہ تر ترقی پذیر ممالک موجودہ ترقی یافتہ ممالک کی کالونیز رہے ہیں انہوں نے کوشش کی ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں ایسا نظام دے جائیں جس سے دولت صرف چند ہاتھوں میں رہے اور ان چند ہاتھوں کو ہم اپنی مرضی سے کنٹرول کریں اگر ترقی پذیر ممالک میں مساوی تقسیم دولت ہو جائے گی تو ترقی پذیر ممالک ترقی کر جائیں گے ترقی پذیر ممالک میں میرٹ کو فروغ ہوگا سستا انصاف ملے گا سیاست میں صاف ستھرے لوگ آئیں گے ترقی پذیر ممالک کے سرمایہ داروں کی دولت ترقی پذیر ممالک میں ہی رہ جائے گی ابھی تک ترقی پذیر ممالک میں غیر مساوی تقسیم دولت کیوں ہے اس کی وجوہات کیا ہے اور اسکے اثرات معاشرے پر کیا ہو رہے ہیں اور اس غیر مساوی تقسیم دولت کو کس حد تک روکا جا سکتا ہے اس کی تفصیل یوں ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی کے غداروں کو انگریزوں نے جاگیریں عطا کی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد ان جاگیرداروں کی ایک لسٹ بنائی جاتی اور ان جاگیرداروں سے یہ جاگیریں بحق سرکار ضبط کر لی جاتیں لیکن ایسا نہ ہو سکا کیونکہ یہی جاگیر دار سیاست اور بیوروکریسی میں ایک سازش کے تحت داخل ہو گئے اس کے برعکس انڈیا میں جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ نہرو رپورٹ چھپنے کے بعد کر دیا گیا نہرو رپورٹ نے جاگیرداروں کو ملک کے سب سے بڑے دشمن قرار دیا یہ بڑے جاگیردار غیر حاضر زمیندار ہوتے ہیں یہ زمینوں کی کاشت صحیح طریقہ سے نہیں کرواتے جس کی وجہ سے کم پیداوار ہوتی ہے یہ سیاست میں داخل ہو کر زیادہ مالی مفادات حاصل کرتے ہیں ان کے خلاف آج تک کوئی موثر قانون اس لئے نہیں بن سکا کیونکہ پاکستان میں دیہاتی آبادی تقریباً 68 فیصد کے قریب ہے اس 68 فیصد آبادی سے جو الیکشن جیت کر آتے ہیں وہ زیادہ تر جاگیردار ہی ہوتے ہیں

جبکہ ترقی یافتہ ممالک کی 70 فیصد آبادی شہروں پر مشتمل ہوتی ہے ضرورت ہے کہ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ کیا جائے جیسا کہ ترقی یافتہ ممالک میں کیا گیا ہے کیونکہ پاکستانی جاگیردار اپنی دولت امپورٹڈ اشیاء، عیاشی، سیر وتفریح، اور دوسری غیر ضروری اشیاء پر خرچ کر دیتے ہیں جبکہ مزارعین اپنی محنت سے روٹی، کپڑا اور مکان کا مسئلہ ہی ساری زندگی حل کر نہیں پاتے۔

غیر متوازن صنعتی ترقی کی وجہ سے پاکستان میں ہوم اینڈ کاٹیج انڈسٹری ترقی نہیں کر سکی جس ملک میں ہوم اینڈ کاٹیج انڈسٹری ترقی کرتی ہے وہاں صنعتی ترقی کا عمل تیز ہو جاتا ہے اور دولت کی تقسیم بھی کسی حد تک مناسب ہو جاتی ہے ٹیکنالوجی کو فروغ حاصل ہوتا ہے عیسائی اور یہودیوں کی کمپنیوں نے جاپان کی معاشی ترقی کو روکنے کی کوشش کی ہے لیکن جاپان اپنی ہوم اینڈ کاٹیج انڈسٹری کی وجہ سے فلاپ نہیں ہو سکا اس کے برعکس انڈونیشیا نے اپنے ملک میں ہوم اینڈ کاٹیج انڈسٹری کو فروغ نہیں دیا اس وجہ سے اسے غیر ملکی بڑی کمپنیوں نے معاشی طور پر برباد کر دیا ہے۔ 1965ء پاکستان میں صنعتوں پر 22 خاندان قابض تھے جو کہ اب بڑھ کر 300 خاندان بن گئے ہیں یہ سب قرضوں کی غلط تقسیم اور ٹیکس کے غلط سسٹم کی وجہ سے ہوا ہے اس وقت بڑے بڑے صنعت کار کھربوں روپے کے نادہندہ ہیں ان نام نہاد صنعت کاروں سے یہ رقم سختی سے وصول کرنی چاہیے اس رقم کا بڑا حصہ ان صنعت کاروں نے ڈالروں کی صورت میں ترقی یافتہ ممالک میں جمع کروا رکھا ہے۔ مقامی ہوم اینڈ کاٹیج انڈسٹری کو زیادہ سے زیادہ مراعات اور آسان شرائط پر قرضہ دینے کی ضرورت ہے۔

ون یونٹ کرنسی ویلیو پاکستان کی کم ہوتی رہتی ہے اس طرح امیر مزید امیر ہو رہا ہے اور غریب مزید غریب ہو رہا ہے 1951ء میں 3.08 روپے کے برابر ایک ڈالر تھا جو کہ 2005ء میں 60 روپے کا ہو گیا ہے اسی نسبت سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا ہے سرمایہ داروں کی دولت بھی اسی نسبت سے بڑھ رہی ہے علاوہ ازیں صنعت کار اپنی مرضی سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کرتے رہتے ہیں حکومت کو چاہیے کہ اشیاء کی قیمتوں میں توازن پیدا کرے تاکہ صنعت کار اپنی مرضی سے منافع کا تعین نہ کر سکے یوٹیلیٹی سٹور پر

حکومت معیاری اشیاء بیچے تا کہ ذخیرہ اندوزی کا خاتمہ ہو سکے اور دکاندار اور صنعت کار اپنا منافع مکمل مقابلہ کی وجہ سے کم رکھیں سمگلروں ذخیرہ اندوزوں اور بلیک میلروں نے اس وقت متوازی معیشت قائم کر رکھی ہے یہ لوگ قانون اور ٹیکس سے بچنے کیلئے مختلف طریقے اپناتے ہیں جس کی وجہ سے غیر مساوی تقسیم دولت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے کیونکہ دولت کا بڑا حصہ حکومت پاکستان کے پاس جمع ہونے کی بجائے ان سمگلروں ذخیرہ اندوزوں اور بلیک میلروں کے فارن اکاؤنٹ میں جمع ہو رہا ہے جسے موثر قوانین سے روکنے کی اشد ضرورت ہے۔

سیاسی بدانتظامی کی وجہ سے دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو رہی ہے سیاسی جماعتیں سرکاری دولت کو اپنی جماعت کے لوگوں کو نوازنے پر خرچ کرتے رہتے ہیں تا کہ ان کی طاقت میں اضافہ ہو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بہتر نہیں سوچتے بڑے بڑے صنعت کار بڑے بڑے سیاسی لوگوں کو انتخابات میں چندہ دے کر اپنے معاشی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں یہ صنعت کار کم شرح سود پر قرضہ حاصل کرتے ہیں امپورٹ اور ایکسپورٹ کے لئے رعایتی ٹیکس کے ایس آر او جاری کرواتے ہیں جس کی وجہ سے عدم مساوات کو فروغ ملتا ہے ان مندرجہ بالا خامیوں کو دور کرنا چاہیے۔

پاکستان میں ٹیکس کا نظام بہتر نہ ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے صنعت کار اور جاگیردار روز بروز امیر ہو رہے ہیں کیونکہ جب بھی کوئی نئے ٹیکس کا نفاذ ہوتا ہے بڑے صنعت کار اور بڑے جاگیردار اپنی اشیا کی قیمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں اس طرح ٹیکس صرف فکس آمدنی والے لوگوں کو دینا پڑتا ہے تاجر اور صنعت کار اپنا ٹیکس عوام کو منتقل کر دیتے ہیں یہ چاہے ٹیکس بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ ہو علاوہ ازیں محکمہ ٹیکس کا عملہ بھی ان کی مدد ٹیکس بچانے میں کرتا رہتا ہے اگر ٹیکس کے عملہ کی سیلری کو بہتر بنایا جائے اور انہیں انعامات دیئے جائیں تو امید کی جاسکتی ہے کہ ٹیکس کی چوری کم ہو جائے گی علاوہ ازیں ٹیکس سسٹم کو بھی بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

ہر فیلڈ میں اجارہ دار پیدا ہو گئے ہیں ان اجارہ داروں کا مقصد حیات صرف روپیہ بنانا

ہے یہ اجارہ دار آپ کو بزنس سیاست اور بیوروکریسی میں نظر آئیں گے ان کے لوگوں کے پاس مخصوص راز ہیں جن سے یہ فائدہ اٹھاتے ہیں ان اجارہ داریاں کو توڑنے کی ضرورت ہے یہ تبھی ممکن ہے کہ ہم پاکستان میں ہر شعبے میں میرٹ سسٹم کو فروغ حاصل ہو۔

پاکستان کے ذہین لوگ جو ترقی یافتہ ممالک کا رُخ کر رہے ہیں اس کی بھی ایک اہم وجہ غیر مساوی تقسیم دولت ہے اگر یہاں متوازن تقسیم دولت ہو تو یہ ذہین لوگ کبھی ترقی یافتہ ممالک کا رُخ نہ کریں اور نہ ہی یہاں کے سٹوڈنٹ بیروزگاری کے ہاتھوں تنگ آ کر دہشت گردوں کے ہاتھ چند روپوں کی خاطر کھلونا بن سکیں۔

اگر مندرجہ بالا خامیوں کو دور کیا جائے تو دیر نہیں کہ پاکستان دنیا کے نقشہ پر ایک ترقی یافتہ ملک بن کر ابھرے کیونکہ یہاں انسانی وسائل اور قدرتی وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے صرف اچھے سسٹم کی کمی ہے پاکستان میں میرٹ اور انصاف کو اگر فروغ دیا جائے تو یہ ملک دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے گا۔

جدید دورِ غلامی

انسان شروع شروع میں مل جل کر رہتے تھے یہ گروہوں کی صورت میں جنگلوں میں نکل جاتے اور جانوروں کا شکار کرتے اور پیٹ کی بھوک مٹاتے غاروں میں عورتیں ان کا انتظار کرتی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عورتوں نے اپنی تنہائی دور کرنے کیلئے سبزیاں ترکاریاں اور پھل کی کاشت شروع کردی ان سبزیوں اور پھلوں سے بھی انسانوں نے اپنے پیٹ کی بھوک مٹانی شروع کردی کچھ وقت گزرنے کے بعد زرخیز زمینوں پر طاقت ور گروہوں نے قبضہ کرلیا اس طرح زراعت ہی کی وجہ سے جاگیردارانہ نظام اور ریاست کے قیام کا آغاز ہوا طاقتور گروہوں نے کمزور انسانوں کو غلام بنانا شروع کردیا اس وقت یہ کوٹیشن بہت عام تھی کہ کچھ لوگ حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں اور باقی لوگ حکم ماننے کیلئے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ کچھ لوگوں کی رگوں میں شاہی خون اور باقی لوگوں کی رگوں میں ادنیٰ خون اور ادنیٰ دماغ ہوتا ہے بعدازاں یہ کوٹیشن سائنس دانوں نے غلط ثابت کردی انہوں نے تجربہ سے بتایا کہ تعلیم وتربیت کے ذریعے انسان کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوجاتا ہے اگر اچھی تعلیم وتربیت نہ کی جائے تو انسان کم عقل رہتا ہے۔

امریکہ کے دریافت ہونے کے بعد غلاموں کی مانگ بڑھ گئی امریکہ کے قدرتی وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے مزدوروں کی ضرورت تھی چنانچہ متعدد یورپی اقوام نے افریقہ سے کثیر تعداد میں حبشی غلاموں کو امریکہ لانا شروع کردیا انگریزوں میں سب سے پہلا شخص جان ہاکنس جس نے غلاموں کی تجارت میں حصہ لیا اور ہسپانوی نوآبادیات کے لئے افریقہ کے باشندوں کو بحیثیت غلام مہیا کرنے کا ٹھیکہ لیا بعد ازاں 1620ء میں ایک ولندیزی جہاز ساحل گنی سے حبشیوں کو بھر کر ورجینا لے گیا جہاں انہیں تمباکو کی کاشت کرنے والے یورپی لوگوں کے ہاتھ فروخت کردیا گیا 1790ء تک

غلاموں کی تجارت ترقی کرتی رہی اور ورجینیا میں تقریباً دو لاکھ حبشی غلام بنا دیئے گئے اس تصویر کا بھیانک رُخ یہ تھا کہ حبشیوں کے سرداروں کو یورپ کی بنی ہوئی مصنوعات کا لالچ دے کر حبشیوں کو کمال سنگدلی اور بے رحمی سے بھیڑ بکریوں کی طرح اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا تھا سردار اپنے آدمیوں کو پکڑ کر یورپی تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے۔

رفتہ رفتہ یورپی اقوام کا انسان دوست طبقہ غلامی کا مخالف ہو گیا اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا ایک انجمن نے جو کویکر کہلاتی تھی غلامی کے خلاف باقاعدہ تحریک شروع کر دی کیمبرج یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے غلامی کے موضوع پر بہترین مضمون لکھنے والے کیلئے انعام کا اعلان کر کے اس سلسلے میں پہلا ٹھوس قدم اٹھایا یہ انعام ٹامس کلارک کو ملا اس کے مضمون کا عنوان ایسے آن دی سلیوری اینڈ کامرس دی ہیومن سپیز

(Essay on the slavery and Commerce of the human species)

اس مضمون کی اشاعت کے سلسلے میں کلارکس کی ملاقات ولیم فورس سے ہوئی چنانچہ 1787 میں ایک انجمن قائم کر دی گئی جس کا واحد مقصد غلامی کو ختم کرنا تھا 1833 میں ایکٹ آف ایمنسی پیشن کی رو سے انگلستان نے غلامی کو ختم کر دیا برطانیہ کی دیکھا دیکھی دوسرے یورپی ممالک نے بھی غلام کے خلاف اقدامات کئے اور امریکہ میں کچھ ریاستوں میں غلامی کی مخالفت شروع ہو گئی لیکن جنوبی امریکہ کی ریاستیں اور کیوبا اور برازیل غلامی کے حق میں تھے امریکہ کے اکابرین میں سیاسی رہنما بھی شامل تھے جو شدت سے غلامی کے مخالف ہو گئے یہ اثرات امریکہ میں مسز ہیریٹ بیچر اسٹوو کی کتاب ''انکل تامز کیبن'' کے طبع ہونے کے بعد زیادہ شدت سے ظاہر ہوئے غلامی کے خلاف اس کتاب نے بہت بڑا جہاد کیا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی ایک طرف شمالی ریاستیں اور دوسری جانب جنوبی ریاستیں صف آرا ہو گئیں یہ لڑائیاں چار سال تک ہوتی رہی بالآخر 1865 میں غلامی کا خاتمہ ہو گیا لیکن برازیل نے 1888 تک غلامی کو جاری رکھا اور نیپال نے 1926ء میں غلامی کا خاتمہ کیا۔ اب دنیا میں جدید غلامی کا دور شروع ہو گیا ہے غریب ممالک کے صحت مند اور موٹے تازہ لوگ یورپ آسٹریلیا اور امریکہ کا رُخ کرتے ہیں یہ لوگ بیس تا پچیس سال تک ایشیا کے ممالک سے کھاتے پیتے ہیں یعنی جتنی دیر

تک یہ غیر پیداواری ہوتے ہیں اتنی دیر تک ترقی پذیر ممالک میں رہتے ہیں بعد میں یہ جوان ہوکر یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا کے کام آجاتے ہیں ان کے جانے سے ترقی یافتہ ممالک میں لیبر میں مکمل مقابلہ پیدا ہوجاتا ہے اس طرح وہاں لیبر سستی ہوجاتی ہے ترقی یافتہ ممالک میں یہ جدید غلام غیر صحت مند کام کرتے ہیں جو کہ ترقی یافتہ ممالک کے باشندے نہیں کرتے جیسے کے پٹرول پمپ پر کام کرنا، ڈش واشنگ، ٹیکسی چلانا، رنگ کا کام کرنا وغیرہ وغیرہ کیونکہ ان کاموں سے غریب ممالک کا انسان اپنی اچھی صحت جلدی کھودیتا ہے ترقی پذیر ممالک امیر ممالک کے جدید غلاموں کے فارم ہیں ایشیاء میں غریب لوگ بچے پیدا کرتے ہیں اور ایشا کے ان غریب لوگوں سے فائدہ امریکہ یورپ اور آسٹریلیا کے لوگ اٹھاتے ہیں کیونکہ وہ صرف ان لوگوں کو چنتے ہیں جو کہ ذہین ہوں یا محنتی ہوں اور کریمنل مائنڈڈ نہ ہوں یہاں سے باقاعدہ بچوں کی بھی سپلائی ہوتی ہے یہ بچے مشرق وسطیٰ میں اونٹ کی ریس میں استعمال ہوتے ہیں انہیں اونٹ کے اوپر بٹھا کر باندھ دیا جاتا ہے جب اونٹ کی ریس شروع ہوتی ہے تو اونٹ کو کوڑے مارے جاتے ہیں کوڑے مارنے سے ایک خوف کی فضا پیدا ہوتی ہے اس خوف سے بچے ریس کے دوران چیخیں مارتے ہیں اس طرح اونٹ ریس پر لطف ہوجاتی ہے اور امیر لوگوں کی تفریح ہوجاتی ہے۔

مردوں کی طرح عورتوں کی بھی غلامی کے فارم ہیں یہ فارم جنسی فارم ہیں یہ بنکاک فلپائن وغیرہ میں ہیں یہاں باقاعدہ لڑکیوں کو جوان کیا جاتا ہے جب وہ بالغ ہوجاتی ہیں تو ان کو جنسی کاروبار میں لگادیا جاتا ہے سولہ سال سے لیکر تیس سال تک وہ ان جنسی فارم میں رہتی ہیں امیر ممالک کے امیر لوگ اور غریب ممالک کے امیر لوگ یہاں آزادی سے لطف اندوز ہوتے ہیں پہلے بادشاہ خوبصورت لڑکیوں کی خاطر جنگیں لڑا کرتے تھے بادشاہت ٹھکرادیتے تھے لیکن اب ہر چیز تجارت میں بدل گئی ہے اب ایشیاء کے ہر ملک میں باقاعدہ مہانہ بیس پر عورت جنسی غلام بنا کر رکھی جاسکتی ہے اس کے لئے مخصوص بازار قائم ہیں یہ ایک بڑا گندہ فعل ہے۔

برصغیر میں باقاعدہ بچے بھی غلام بنا کر رکھے جاتے ہین یہ بچے غریب آدمی پیدا کرتے ہیں یہ بچے دس سال کی عمر میں امیر آدمیوں کے گھر آجاتے ہیں گھر کا چھوٹا موٹا سودا لاتے ہیں امیر آدمیوں کے بچوں کو سیر کراتے ہیں اور خوش کرتے ہیں ان کے ماں

باپ تین سو روپے سے لیکر پانچ سو روپے بھتہ لے کر جاتے ہیں ان کے کوئی لیبر آورز بھی نہیں ہیں انہیں چوبیس گھنٹے حاضر رہنا پڑتا ہے۔ اس طرح فیکٹریوں میں بھی ہو رہا ہے یہاں جوان لڑکے کام کرتے ہیں یہ لڑکے پیشگی رقم وصول کرتے ہیں یہ باقاعدہ ماں باپ کے ساتھ ٹیکسٹائل ملوں، سینٹری ویئر کے کارخانوں میں رہتے ہیں یہ فیکٹریاں چوبیس گھنٹے چلتی ہیں یہاں عید شب برات اور دوسرے مذہبی تہواروں کی کوئی چھٹی نہیں ہوتی بلکہ اس دن کام کرنے والوں کو ایک دن کی اضافی تنخواہ دی جاتی ہے باقاعدہ چاولوں کی دیگیں پکائی جاتی ہیں یہ سب غیر مساوی تقسیم دولت کا کمال ہے جسے ختم ہونا چاہیے۔

اگر یورپ کی طرح ایشیا میں بھی فلاحی مملکتیں بنادی جائیں تو یہ جدید غلامی کا نظام ختم ہوسکتا ہے یہاں بھی یورپ کی طرح تعلیم صحت اور انصاف مہیا کرنے کی حکومت کی ذمہ داری ہو تو یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے انٹرنیشنل مالیاتی ادارے جیسے آئی ایم ایف اور انٹرنیشنل بنک اگر صدق دل سے ترقی پذیر ممالک کی معاشی ترقی چاہتے ہیں تو انہیں ترقی یافتہ ممالک کو مشورہ دینا چاہیے کہ وہ ویزہ سسٹم ختم کردیں صرف پاسپورٹ پر انٹری ہو تو پوری دنیا میں معاشی استحصال ختم ہوجائے گا جہاں جس چیز کی ضرورت ہوگی وہ وہاں پہنچ جائے گی یعنی محنت سرمایہ تنظیم وغیرہ وغیرہ کیونکہ ترقی یافتہ ممالک اپنی مرضی سے ترقی پذیر ممالک کے لوگوں کو ویزہ دیتے ہیں جبکہ ترقی یافتہ ممالک کے لوگ جہاں چاہیں جاسکتے ہیں ویزہ سسٹم ختم کرنے سے دنیا ایک امن کا گہوارہ بن جائے گی ایک اور تجویز یہ ہے کہ کرنسی کی ون یونٹ قدر ترقی پذیر ممالک اور ترقی یافتہ ممالک میں اگر برابر کردی جائے تو ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر ممالک کا استحصال نہیں کرسکیں گے اس کی وجہ سے ترقی پذیر ممالک کا امپورٹ اور ایکسپورٹ کا توازن ادائیگی بہتر نہیں ہوتا ہے اس کرنسی کے فرق کی وجہ سے امریکہ میں جو مزدور تین ہزار تنخواہ لیتا ہے اس کی تنخواہ پاکستان میں تقریباً ایک لاکھ اسی ہزار ہوجاتی ہے یہ کرنسی کا فرق ہی برین ڈرین یعنی انسانی وسائل کی منتقلی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے اس کی وجہ سے غریب ملک مزید غریب ہو رہے ہیں کرنسی چھاپنے کا ایک عالمی ادارہ ہونا چاہیے اور کرنسی کی ون یونٹ قدر برابر ہونی چاہیے۔

سائنس اور معیشت

سائنس نے علم کی بنیاد رکھی اور علم سے انسان نے حاصل کیا کہ کیسے انسان زندہ رہ سکتا ہے اور کیوں زندہ رہتا ہے۔

علم کے لغوی معنی جاننا کہ ہیں لیکن اصطلاحی معنوں میں علم سے مراد معلومات کا وہ مجموعہ ہے جو کہ باقاعدہ غیر جانبدارانہ مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل ہوتا ہے علم حاصل کرنے سے انسانی صلاحیتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

علم کی دو اقسام ہیں:

(۱) علم الحقیقت

(۲) علم الدایت

۱۔ علم الحقیقت سے مراد سائنس کا علم ہے۔

2۔ علم الدایت سے مراد معاشرتی علوم ہیں۔

علم انسان دانش وروں اور ماں باپ کی صحبت سے، مختلف علاقوں کے سفر سے، کتابوں کے مطالعہ سے، پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانکس میڈیا وغیرہ وغیرہ اور حواص خمسہ کا صحیح استعمال کر کے حاصل کرتا ہے۔ علم الدایت کے علوم میں سے معاشیات کا علم بہت اہمیت کا حامل ہے۔ معاشیات سے مراد ایسا علم ہے جو انسان کو معاشی ترقی، پیداوار کی تقسیم اور اضافہ، دولت کی تقسیم اور اضافہ میں مدد دیتا ہے۔ معاشی ترقی سے مراد یہ ہے کہ:

(۱) قومی آمدنی میں مسلسل اضافہ

(۲) قومی پیداوار میں مسلسل اضافہ

(۳) فی کس قومی آمدنی میں مسلسل اضافہ

(۴) آمدنی میں اضافہ کا فائدہ عوام تک پہنچانا

(۵) کرنسی کی ون یونٹ قدر میں اضافہ

معاشیات کا علم ہمیں بتاتا ہے کہ معاشی ترقی کیلئے اگر ہم سائنس کو اہمیت دیں اور سیاسی استحکام ترقی پذیر ممالک میں پیدا کریں تو کوئی بات نہیں کہ ترقی پذیر ممالک معاشی ترقی نہ کرسکیں سیاسی استحکام کے لئے ضروری ہے کہ ہم بھی امریکہ اور برطانیہ کی طرح دو پارٹی سسٹم قائم کریں تا کہ ترقی پذیر ممالک سیاسی انتشار اور سیاسی جماعتوں کی بلیک میلنگ سے بچ سکے۔ جمہوری حکومت مناسب پیداواری سرمایہ کاری اور قانون سازی کرے۔ سائنس سے محرومی سیاسی عدم استحکام اور علم معاشیات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہمارے انسانی وسائل، قدرتی وسائل اور سرمایہ سے ترقی یافتہ ممالک فائدہ اٹھا رہے ہیں اگر ہم درج ذیل سائنسی علوم کو طالبعلموں تک پہنچائیں اور ان شعبوں کو ترقی دیں تو پاکستان، اسلامی ممالک اور ترقی پذیر ممالک کی معیشت بہتر ہوسکتی ہے

(۱) گیس ٹیکنالوجی (۲) انرجی ٹیکنالوجی

(۳) ہائیڈرو پاور پر کام (۴) نیوکلیئر ٹیکنالوجی

(۵) میٹکل اور سیلیکان ٹیکنالوجی (۶) الیکٹرانکس انجینئرنگ

(۷) ڈیفنس ٹیکنالوجی (۸) کمپیوٹر ایجوکیشن اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی

(۹) سپیس ٹیکنالوجی (۱۰) بائیوٹیکنالوجی

(۱۱) فزکس ایجوکیشن (۱۲) جیوتھرمل پروگرام کو فروغ

(۱۳) مالیکیولر بیالوجی (۱۴) جنیٹک انجینئرنگ

(۱۵) ٹیلی کام ٹیکنالوجی (۱۶) آٹو موبائل ٹیکنالوجی

(۱۷) انفارمیشن ٹیکنالوجی (۱۸) لیبارٹریز اور تحقیقاتی سنٹر قائم کرنا

جب ترقی پذیر ممالک مندرجہ بالا علوم اور شعبوں کو ترقی دیں گے تو علم معاشیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ درج ذیل معیشت پر مثبت اثرات پڑیں گے۔

عوام کی سوچ سائنسی ہوجائے گی وہ مادی خوشحالی کو زندگی کیلئے ضروری تصور کریں گے جہالت و ناخواندگی کا خاتمہ ہوجائے گا لوگ قدامت اور قناعت پسند ہونے کی بجائے

تسخیر کائنات کا عزم لے کر محنت کریں گے ان کی انتظامی صلاحیتوں میں اضافہ ہو جائے گا وہ ملکی وسائل کو بہتر طور پر استعمال کر کے فائدہ اٹھا سکیں گے لوگوں کی سائنسی سوچ ہونے کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ ہو جائے گا ترقی پذیر ممالک میں ابھی تک پیداوار کے ذرائع بہت پرانے ہیں جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں مینز آف پروڈکشن (Means of Production) جدید ترین ہیں جیسے کہ پاکستان میں ابھی تک زراعت میں بیل کا استعمال جاری ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں زراعت کی پیدائش سے لے کر کٹائی تک سب مشینی کام ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بارش بھی مصنوعی ہو جاتی ہے۔

سائنسی اور فنی تعلیم ہونے کی وجہ سے لیبر کی بھی ہنر مندی میں اضافہ ہوگا اس ہنر مندی کے اضافہ کی وجہ سے لیبر خراب مشینری کو خود مرمت کرنے کے قابل ہو جائے گی کئی کئی دن مشینیں بند نہیں رہیں گی مشینری کے سپیئر پارٹس بننے شروع ہو جائیں گے ترقی پذیر ممالک کو سڑک بنانے کے لئے، ڈیم بنانے کیلئے، بڑے بڑے کارخانے لگانے کیلئے، ترقی یافتہ ممالک سے ماہرین منگوانے پڑتے ہیں جو کہ ڈالروں میں تنخواہ حاصل کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ ترقی پذیر ممالک کے سیاسی و معاشی راز بھی لے جاتے ہیں ان خرابیوں سے ترقی پذیر ممالک بچ جائیں گے اور ملک سائنسی علوم کی وجہ سے معاشی ترقی کرے گا۔

انسانی دماغ وسائل پیدا کرتا ہے سائنس دان اور انجینئر ہی اپنے ملک کے وسائل کو صحیح استعمال کر کے ملک کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں موجودہ صدی کی سب سے بڑی ایجاد کمپیوٹر انسانی دماغ کی ہی پیداوار ہے اس میں کسی قسم کے قدرتی وسائل کا کوئی تعلق نہیں ہے امریکہ کی کمپیوٹر بنانے والی کمپنی کے پاس پاکستان سے بڑا بجٹ ہے یہ سب کچھ سائنسی علوم ہی کی وجہ سے ہوا ہے کمپیوٹر انسان کے دماغ ہی کی پیداوار ہے جاپان جس کے پاس قدرتی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں نے بھی معاشی ترقی سائنسی شعبوں کی ہی بنیاد پر کی ہے ہمارے مالیاتی اداروں کے چیئرمین 20 لاکھ روپیہ تک تنخواہ لے رہے ہیں جبکہ سائنس دان صرف چند ہزار روپوں میں تنخواہ لے رہے ہیں سائنس دانوں کو معقول معاوضہ دینے کی ضرورت ہے۔

حضرت آدم علیہ اسلام اور اماں حوا کو اس دنیا میں بغیر لباس کے بھیجا گیا تھا اب انہی

کی اولاد نے سمندر زمین اور خلا میں وسائل پیدا کر لئے ہیں فنی علم کی بنیاد پر ترقی یافتہ ممالک
اسلامی ممالک کے وسائل سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اس وقت اسلامی دنیا کے پاس 60 فیصد
تیل، 40 فیصد قدرتی گیس 80 فیصد ربر اور 75 فیصد پٹ سن ہے مگر باوجود وسائل کے
مسلمان ان سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں کیونکہ ان کے پاس سائنسی علوم اور معاشی علم کی کمی
ہے اور نہ ہی ابھی تک وہ سیاسی طور پر مکمل آزاد ہیں اگر اب بھی مڈل ایسٹ کے مسلمان
ممالک مصر پاکستان بنگلہ دیش اور انڈونیشیا کے مسلمان ہنرمندوں کو اپنے ملک کی شہریت
دیں جیسے انڈر پاپولیشن ترقی یافتہ ممالک کینیڈا آسٹریلیا اور امریکہ ترقی پذیر ممالک کے
ہنرمندوں کو دے رہے ہیں تو اس طرح اسلامی ممالک عسکری اور معاشی دونوں طرح سے مضبوط
ہو گئے اور اسی ترقی کے اثرات مصر پاکستان بنگلہ دیش اور انڈونیشیا تک بھی پہنچے گے۔

فرانس کے اندر جو انقلاب آیا ہے اس میں سائنسی سوچ کا اثر تھا اس وقت کے
فلاسفروں نے سائنسی علوم معاشی علوم اور سیاسی آزادی پر زور دیا اس ذہنی انقلاب کے بعد
وہاں معاشی اور سیاسی انقلاب آیا جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہوا کیونکہ جاگیردار اپنے علاقہ
میں تعلیم معاشی ترقی اور سیاسی آزادی نہیں آنے دیتا ہے جیسے کہ ترقی پذیر ممالک میں
جاگیردار اب بھی اپنے علاقوں میں یہی حرکت کر رہے ہیں فرانس کے انقلاب کے بعد
فرانس میں صنعتی ترقی ہوئی دولت کی غیر مساوی تقسیم کا کافی حد کا خاتمہ ہوا سیاسی آزادی
ہوئی پاکستان میں اب بھی جاگیردار نظام موجود ہے یہاں کا جاگیردار زمین کو پیداواری
مقاصد کیلئے استعمال نہیں کرتا بلکہ اس سے سیاسی فوائد حاصل کرتا ہے سائنسی اور فکری
انقلاب کی وجہ سے یہ نظام ختم ہو جائے گا اور صنعتی ترقی ہوگی۔

تعلیم ہی کی بنیاد پر گردش زر میں اضافہ ہو جاتا ہے لوگ اپنے پاس دولت رکھنے کی
بجائے بنکوں میں رکھتے ہیں اس طرح بنکاری کو فروغ حاصل ہوتا ہے اچھے صنعت کاروں کو
قرضہ ملتا ہے سائنسی تعلیم سے فارغ ہونے والے طالب علم بنک سے قرضہ لے کر نئی نئی
ایجادات کرتے ہیں۔

منافع، جدت، اجارہ داری اور رسک کا نام ہے ترقی یافتہ ممالک کے سائنس دانوں

نے کمپیوٹر، جدید اسلحہ اور جہاز بنا کر منافع کمانے کی یہ شرائط پوری کردی ہیں اور اب وہ اپنی الیکٹرانکس گڈز اور آرمز اینڈ ایجوکیشن کو سونے سے زیادہ قدر و قیمت پر فروخت کر رہے ہیں اس طرح ان کا توازن ادائیگی بھی بہتر ہوگیا ہے اور ترقی پذیر ممالک کے وسائل بغیر جنگ کے ان کی طرف منافع کی صورت میں منتقل ہو رہے ہیں۔

پاکستان ایک زرعی ملک ہے لیکن ابھی تک ہم زرعی ادویات، کھاد اور ٹریکٹر وغیرہ وغیرہ میں خود کفیل نہیں ہو سکے تعلیم کا معیار تقریباً 30 فیصد ہے اور سائنسی و فنی تعلیم صرف ایک فی صد کے برابر ہے ہمارے قدرتی وسائل اور اشیاء کی قیمت انٹرنیشنل سطح پر کرنسی کی کم قدری کی بنیاد پر بہت کم ملتی ہے اگر پاکستان اور ترقی پذیر ممالک سائنسی اور معاشی تعلیم کو سستا اور نچلی سطح پر کام کریں اور تحقیقاتی سنٹر قائم کریں تو کوئی بات نہیں پاکستان ایک ترقی یافتہ ملک بن جائے بے شک وہی ملک ترقی کرتا ہے جو اپنے قدرتی وسائل انسانی وسائل اور ٹیکنالوجی پر بھروسہ کرتا ہے اور عوام کو انصاف مہیا کرتا ہے کیونکہ اب روایتی جنگ کا دور کسی حد تک ختم ہوگیا ہے اب جنگ نئے انداز سے لڑی جا رہی ہے جسے معاشی جنگ کہہ سکتے ہیں۔

کمپنیوں کی حکومت

یورپ میں سولہویں اور سترہویں صدی میں جائنٹ سٹاک کمپنیاں قائم ہوئیں تو ان میں زیادہ تر سرمایہ کاری یہودی مہاجن خاندانوں نے کی ان کمپنیوں میں سات کمپنیاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے تھیں پہلی امریکی ورجینیا کمپنی بھی لندن ہی میں قائم ہوئی یہ کمپنیاں جو بڑے بڑے سرمایوں سے وجود میں آئی تھیں دراصل ان کو اپنی حکومتوں کی مکمل تائید اور آشیر باد حاصل تھی اس لئے وہ اپنی حکومتوں سے زیادہ سے زیادہ تجارتی حقوق ہی نہیں بلکہ اجارہ داری بھی حاصل کر لیتی تھیں اور اسی اجارہ داری کی بدولت ان کمپنیوں نے ایشیاء افریقہ اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کے وسائل سے خوب فائدہ اٹھایا انہی کمپنیوں کے مہاجنوں اور تاجروں نے مل کر سولہویں صدی میں بنکوں کی بنیاد رکھی اور ہنڈی (Bill of Exchange) کے استعمال کا سسٹم شروع کیا۔

یہ یہودی اور عیسائی کمپنیاں یورپ سے باہر دوسرے ملکوں میں اس لئے نکلی کیونکہ ان ملکوں کے عوام کی قوت خرید جواب دینے لگی تھی دوسرے الفاظ میں ان کمپنیوں کی پیداوار ''زائد پیداوار'' ہوگئی تھی اس زائد پیداوار کو دوسرے ممالک میں ایکسورٹ کرنے میں ٹیکس اور دوسری مشکلات پیش آتی تھی ان سے بچنے کیلئے ان کمپنیوں نے ایشیا اور افریقہ کا رخ کیا ان کو اپنی تجارتی چوکیاں بنایا یہاں کی لیبر بھی انہوں نے سستے داموں خریدی۔ اب پھر ان کارپوریشنوں اور کمپنیوں نے پروپیگنڈہ شروع کیا ہے کہ یہ کمپنیاں ترقی پذیر ممالک کے عوام کی تقدیر بدل دے گی یہ ان ممالک میں روزگار میں اضافہ اور معاشی ترقی میں مدد دے گی بے شک عارضی طور پر روزگار میں اضافہ ہو جائے گا لیکن مستقل طور پر یہ کمپنیاں نقصان پہنچائے گی جس کیلئے مڈل ایسٹ، افریقہ اور ایشیا کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ سابقہ مثال ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں کردار اور موجودہ مثال ان کمپنیوں کا

افریقہ اور مڈل ایسٹ میں کردار ہے یہ کمپنیاں اس لئے ترقی پذیر ممالک میں تیزی سے داخل ہورہی ہے کیونکہ اب اسلحہ انڈسٹری تقریباً ختم ہورہی ہے روس کے ٹکڑے ہو چکے ہیں جس سے ترقی یافتہ ممالک کو خوف زدہ کر کے اسلحہ فروخت کرتے تھے اب ترقی یافتہ ممالک نیا جال کمپنیوں کی صورت میں لے کر داخل ہورہے ہیں یہ کمپنیاں کسی ملک کے قدرتی وسائل انسانی وسائل کو کیسے ترقی یافتہ ممالک میں منتقل کرتی ہیں اور ان ممالک کی ٹیکنالوجی میں ترقی کیسے روکتی ہیں اور ان کمپنیوں کا طریقہ کار کیا ہے۔اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

ان کمپنیوں نے یوٹیلیٹیز (Utilities) کے ادارے خریدنا شروع کر دیئے ہیں یوٹیلیٹیز سے مراد بجلی، سوئی گیس، ٹیلی فون، پانی، سیوریج اور تیل کے کنوئیں (پٹرول پمپ) وغیرہ ہیں۔پاکستان میں اکثریت مڈل کلاس کے لوگ اور غریب لوگ اپنی تنخواہ یا آمدنی کا 1/3 حصہ اسی یوٹیلیٹیز پر خرچ کر دیتے ہیں اس لیے ان کمپنیوں نے ان اداروں کو خریدنا شروع کر دیا ہے پہلے آئی ایم ایف ان اداروں کو کہتا تھا کہ یوٹیلیٹیز کی قیمتیں بڑھاؤ لیکن اب اسے ایسا کہنے کی ضرورت نہیں رہی ہے کیونکہ فارن کمپنیاں ان اداروں کو بڑی تیزی سے خرید رہی ہیں۔یہ سب منافع بخش انڈسٹری ہے اس کی اہمیت بھی بنیادی ضروریات یعنی روٹی کپڑا مکان جیسی ہوگئی ہے اس کی سیل بھی پورا سال رہتی ہے ان ہی کمپنیوں نے مڈل ایسٹ میں تیل کے کنویں خریدے ہوئے ہیں قدرتی وسائل مڈل ایسٹ کے ہیں لیکن فائدہ یہ کمپنیاں اٹھا رہی ہیں اسی وجہ سے پاکستان کے اندر سرد بازاری ہے کیونکہ عام صارفین اپنی بنیادی ضروریات یعنی روٹی کپڑا، مکان، سوئی گیس، بجلی، پانی، سیوریج، طبی سہولیات اور تعلیم پر ہی اپنی ساری آمدنی صرف کر دیتے ہیں ان کی بچتیں نہ ہونے کے برابر ہوگئی ہیں۔وہ دوسری آسائشی ضروریات کی اشیاء کیسے خریدیں یوٹیلیٹیز مہنگی ہونے کی وجہ سے نیشنل انڈسٹری بین الاقوامی انڈسٹری سے مقابلہ بازی میں مات کھا رہی ہے اور مقامی انڈسری بند ہورہی ہے۔

بے شک یہ کمپنیاں ٹیکس بہت زیادہ دیتی ہیں مثال کے طور پر ٹیکس دینے والی پانچ بڑی انڈسٹری (۱) ٹوبیکو (۲) بیوریج (۳) سیمنٹ (۴) شوگر (۵) آئل میں سے تین انڈسٹری سگریٹ مشروبات اور آئل کی فیکٹریاں فارن کمپنیاں چلا رہی ہیں یہ کمپنیاں کسٹم ڈیوٹی

سیلز ٹیکس سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی کی مد میں بہت زیادہ ٹیکس فراہم کر رہی ہیں اور لوگوں کو روزگار بھی دے رہی ہیں لیکن خود کتنا منافع کمار ہی ہیں اس کا کوئی حساب نہیں یہ کمپنیاں ٹیکس کو پاکستانی صارف پر منتقل کر دیتی ہیں اور اصل میں ترقی پذیر ممالک کا صارف ہی اصل ٹیکس گزار ہے کیونکہ یہ ٹیکس کمپنیوں سے صارف کو قیمتوں میں اضافہ کی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے۔

ایک سیاسی کہاوت ہے کہ We rule men with words یعنی لوگوں کے دلوں پر حکومت اچھے الفاظ سے کی جاتی ہے پراپیگنڈہ کے لئے یہ کمپنیاں ٹی وی اسٹیشن خریدتی ہیں علاوہ ازیں پرنٹ میڈیا میں یہ مخصوص تنخواہ دار ملازم رکھتی ہیں اور ایڈورٹائزنگ کے ذریعے اپنی اشیاء کی مانگ بڑھاتی رہتی ہیں۔ یہ کمپنیاں اتنی طاقت ور ہیں کہ ان کے مقابلہ میں کوئی نیشنل کمپنی کامیاب نہیں ہوتی مثلاً پاکستان ابھی تک کوئی نیشنل باتھ سوپ تیار نہیں کر سکا اور نہ ہی کوکا کولا، سپرائٹ، پیپسی، ٹیم، سیون اپ کے مقابلہ میں مشروبات تیار ہو سکے ہیں اسی طرح سگریٹ انڈسٹری جیسے گولڈ لیف ولز اور کیپسٹن کے مقابلہ میں کوئی سگریٹ تیار نہیں ہو سکا اس کی وجہ یہ ہے کہ اتنا سرمایہ کسی نیشنل صنعت کار کے پاس نہیں ہے علاوہ ازیں ان کمپنیوں کے ہوتے ہوئے کوئی بھی نیشنل صنعت کار رسک نہیں لیتا اگر یہ کمپنیاں نہ ہو تو صارفین کو مجبوری سے پاکستانی اشیاء خریدنی پڑیں اس طرح فنی مہارت میں بھی اضافہ ہو آہستہ آہستہ قومی اشیاء کی پیداوار کا معیار بھی بین الاقوامی ہو جائے جیسے جاپان نے ڈویژن آف لیبر (Division of Labour) کر کے بلند کیا ہے جاپان میں ہوم اینڈ کاٹیج انڈسٹری بہت زیادہ ہے ہر چھوٹی انڈسٹری مخصوص سپیئر پارٹس بناتی ہے اس کے مزدور بھی اسی سپیئر پارٹ کے سپیشلسٹ ہو گئے ہیں اس طرح سپیئر پارٹ کا معیار بھی بلند ہوا ہے اور پیداوار میں بھی اضافہ ہوا ہے جیسے کہ گوجرانوالہ میں واشنگ مشین انڈسٹری کام کر رہی ہے۔

یہ کمپنیاں انٹرنیشنل مالیاتی اداروں سے مل کر کسی ملک کی معاشی ترقی کے منصوبے بناتی ہیں اور اس میں اپنے مفادات کو مخصوص طریقہ سے شامل کر دیتی ہیں یہ کمپنیاں مختلف ممالک کو قرضہ دینے اور تختہ الٹانے میں بھی کردار ادا کرتی ہیں جیسا کہ 1952ء میں ڈاکٹر مصدق نے ایرانی تیل کو قومیانے کی کوشش کی تب ہی برٹش پٹرولیم اور سی آئی اے نے ڈاکٹر مصدق

کی حکومت کا تختہ الٹا دیا یہ کمپنیاں بہت ہیوی ادارے ہوتے ہیں جو سوئی سے لے کر جہاز تک بناتی ہیں ان کمپنیوں کے ذاتی اخبارات ریڈیو اسٹیشن ٹی وی اسٹیشن ڈش چینل ہیں جیسا کہ بظاہر پاکستان آئل کمپنی، پاکستان پٹرولیم اور پاکستان ٹوبیکو کمپنی وغیرہ پاکستانی کمپنیاں معلوم ہوتی ہیں لیکن دراصل یہ کمپنیاں ترقی یافتہ ممالک سے تعلق رکھتی ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک نے ترقی پذیر ممالک کو اسلحہ بیچ کر آپس میں جنگ کروا کے ان کے وسائل کو اپنے ممالک میں منتقل کیا اس کی مثال عراق ایران جنگ عراق کویت جنگ ہے یہ کمپنیاں ہمارے قدرتی وسائل انسانی وسائل کو اپنے ترقی یافتہ ممالک میں منتقل کر رہی ہیں جتنی بڑی دواساز کمپنیاں، آئل کمپنیاں، بیوریج کمپنیاں، سگریٹ کمپنیاں کاسمیٹکس کمپنیاں اور کیڑے مار ادویات کی کمپنیاں ہیں سب ترقی یافتہ ممالک کی ہی کمپنیاں ہیں غرض بڑی مچھلی کے چھوٹی مچھلی کو کھانے کا عمل جاری ہے انہی کمپنیوں نے ہندوستان اور پاکستان میں سرمایہ کاری کی ہے اور یہ ہی ہندوستان اور پاکستان کی خارجہ پالیسی تبدیل کروانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں تاکہ امن کی صورت میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری ہو امن کی صورت میں یہ کمپنیاں چائنہ انڈسٹری اور ایران انڈسری کا مقابلہ کر سکے گی اور انہیں ایشیا کی مارکیٹ سے آؤٹ کرنا امن کی صورت میں ہی ممکن ہے۔

اگر ترقی یافتہ ممالک اپنے ممالک میں لیبر یونین مضبوط کر لیں اور انٹرنیشنل لیبر قوانین تیار کر لیں جس کے مطابق لیبر کو سالانہ منافع میں حصہ یا لیبر کی تنخواہ ترقی یافتہ ممالک کی لیبر کی تنخواہ کے قریب ہو اور انہیں بھی وہ تمام سہولتیں میسر ہوں جو کہ ترقی یافتہ ممالک کی لیبر کو ہوتی ہیں تو تب ہی یہ کمپنیاں ترقی پذیر ممالک کا کم از کم استحصال کر سکے گی کیونکہ ان کے منافع اور دولت بنانے کا راز ترقی پذیر ممالک کے قدرتی وسائل، انسانی وسائل اور یوٹیلیٹیز سے استفادہ کرنا ہے اور اپنی زائد پیداوار کو ان کے آگے بیچنا اور سستے داموں لیبر خریدنا ہے بے شک وہی ملک ترقی کرتا ہے جو کہ اپنے وسائل کو خود استعمال کرتا ہے کیونکہ خدا بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔

سپر پاور کی سپر کرنسی

سپر پاورز سے مراد وہ ممالک ہیں جن کو عسکری برتری وسائل کی برتری ٹیکنالوجی کی برتری اور کرنسی کی برتری وغیرہ حاصل ہے یہ ممالک ترقی یافتہ ممالک کہلاتے ہیں۔

کرنسی زر کی ایک قسم کی ہے زر سے مراد ایسی شے ہے جو کہ قبولیت عام کا درجہ رکھتی ہے اسے اشیاء وخدمات کے تبادلے کے طور پر قبول کیا جاتا ہے اسے پیمانہ قدر اور ذخیرہ قدر کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

زمانہ قدیم میں جب زر کی دریافت نہیں ہوئی تھی تو لوگ اپنی ضروریات کی اشیاء اپنی پیدا کردہ اشیاء کے بدلے میں حاصل کرتے تھے یہی طریقہ کار بین الاقوامی تجارت میں اپنایا جاتا تھا اس سسٹم کو بارٹر سسٹم (Borter System) کہا جاتا تھا اس کے بعد دھاتی زر کو آلہ مبادلہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا چنانچہ انسان نے زری مقاصد کے لئے مختلف دھاتوں کا استعمال شروع کیا سونے اور چاندی کو دھاتی زر کے طور پر استعمال کیا گیا جب ترقی یافتہ ممالک کو اس سے خاطر خواہ فوائد حاصل نہ ہوئے تو ان سپر پاورز نے کاغذی زر کا نظام بین الاقوامی تجارت کیلئے متعارف کروایا کاغذی زر یعنی کرنسی کے آغاز کے بعد اب اعتباری زر یعنی چیک ڈرافٹ تحریری وعدہ اور ہنڈی کا بھی استعمال شروع ہوگیا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب برطانیہ نے کچھ کالونیز کو آزاد کیا تو انہیں آزادی دینے کے ساتھ کاغذی زر کا ایک نظام دیا اور اس کاغذی زر کی پرنٹنگ اور مقدار پر اپنا کنٹرول رکھا لیکن اپنی کرنسی پر کسی بھی نو آزاد ملک کا کنٹرول نہ رکھا دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنے مالی نقصان کو پورا کرنے کیلئے برطانیہ نے سٹرلنگ اور امریکہ نے ڈالر چھاپے ان کاغذ کے ٹکڑوں سے انہوں نے ترقی پذیر ممالک اور نو آزاد ریاستوں کے وسائل منتقل کئے اب انہوں نے مزید معاشی مفادات حاصل کرنے کیلئے جدید طریقہ کار اپنا لیے ہیں۔

1990ء سے پہلے جو ایٹم ایکسپورٹ ہوتی تھی اس کی باقاعدہ باہر سے رقم ڈالر، پاؤنڈ، مارک میں آتی تھی لیکن 1990ء فارن کرنسی ایکٹ کے تحت فارن کرنسی کی فری امپورٹ اور ایکسپورٹ کر دی گئی ایکسپورٹر کو اجازت دے دی گئی بے شک باہر سے رقم آئے یا نہ آئے وہ اگر بنک میں فارن کرنسی جمع کروا کے Payment Receipt Certifcate حاصل کر لیتا ہے تو محکمہ کسٹم ایکسپورٹ ایٹم پر ریبیٹ دینے کا مجاز ہوگا اس طریقہ کار سے پاکستان کو کافی مالی نقصان ہو رہا ہے۔

(i) بوگس ایکسپورٹ ہو رہی ہے۔

(ii) ایکسپورٹر اپنی رقم سپر پاور کے بنک میں سپر کرنسی کی شکل میں جمع کروا دیتے ہیں۔

1990ء سے فارن کرنسی اکاؤنٹ کا نظام جاری کر دیا گیا اس سے پہلے فارن کرنسی اکاؤنٹ کی اجازت نہیں تھی بنک میں رقم صرف پاکستانی روپے کی صورت میں جمع ہو سکتی تھی اب بنک نے فارن کرنسی ایکٹ 1990ء کے تحت فارن اکاؤنٹ کو زکوٰۃ اور ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے دیا ہے اس کے برعکس پاکستانی روپے کی بنک میں چھان بین ہو سکتی ہے اس پر زکوٰۃ بھی نافذ ہو جاتی ہے اب ہر سمجھ دار آدمی کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ فارن کرنسی میں اکاؤنٹ کھولے اس پالیسی سے پاکستانی روپے کی زرمبادلہ کی حیثیت کو کافی نقصان پہنچ رہا ہے۔

ملائشیا، کوریا اور انڈونیشیا نے جب ترقی کرنا شروع کی تو سپر پاورز کو ایک نظر بھی اچھی نہیں لگی انہوں نے فوراً ان ممالک کی کرنسی کی ڈی ویلوایشن (Currensy Devleuation) کر دی جس سے پاکستان ملائشیا کوریا اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کی معیشت پر بہت منفی اثرات ہوئے یہ ممالک ترقی پذیر ممالک کو اپنی کالونیز کی طرح ڈیل (Deal) کرتے ہیں اس کے برعکس آئی ایم ایف، عالمی بنک اور سپر پاورز آئے دن پراپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں کہ ہم ترقی پذیر ممالک کی ترقی چاہتے ہیں۔

علاؤالدین خلجی نے اپنی حکومت کے دوران میں اشیاء کی قیمتوں میں استحکام رکھا جب تک وہ حکمران رہا قیمتوں میں کوئی تبدیلی نہ آئی اسے برصغیر کا معیشت دان بھی کہا جا سکتا ہے لیکن کرنسی کی ڈی ویلوایشن کی پالیسی کی وجہ سے ترقی پذیر ممالک میں ہر سال افراط زر

ہوجاتا ہے جوکہ بڑھتا ہی چلا آرہا ہے افراط زر کے اثرات میں ہر سال قیمتوں کا بڑھنا شامل ہے پاکستان بننے کے وقت ڈالر اور روپے کی شرح تبادلہ تقریباً برابر تھی اب 2006ء میں ڈالر تقریباً 60 روپے کا فری مارکیٹ میں ملتا ہے یعنی 6 ہزار فی صد افراط زر ہوا ہے۔ یہ افراطِ زر 59 سال کے عرصہ کے دوران ہوا ہے۔ 1947ء میں اس کی قیمت 3 ڈالر تھی اب بھی اس خام مال کے بنے فٹ بال کی قیمت تین ڈالر ہی ہے یعنی پاکستان میں افراط زر بڑھ گیا لیکن سپر کرنسی ممالک میں افراط زر نہ ہونے کے برابر ہے اس افراط زر کی وجہ سے غریب مزید غریب ہورہا اور امیر مزید امیر ہورہا ہے غریب ممالک میں اور یہ ہی عمل ترقی پذیر ممالک اور ترقی یافتہ ممالک کے اندر ہورہا ہے کرنسی کی ڈی ویلوایشن کی وجہ سے ترقی پذیر ممالک کے ذہین اور محنتی لوگ ترقی یافتہ ممالک میں روزگار کی تلاش میں چلے جاتے ہیں وہاں اگر انہیں 2 ہزار امریکن ڈالر تنخواہ ملتی ہے تو پاکستان میں یہ 1,20,000 ہزار روپے بن جاتی ہے۔

ترقی پذیر ممالک اگر بارٹر سسٹم کے تحت تجارت کرتے تو آج وہ قرضوں کے بوجھ تلے نہ دبے ہوتے کیونکہ اس سسٹم کے تحت کسی کو قرضہ لینے کی ضرورت نہیں تھی اب تو یہ علم نہیں ہوتا کہ کتنا قرضہ پاکستان نے لیا ہے اور کہاں صرف کیا ہے ان منصوبوں سے جن پر قرضہ لے کر خرچ کیا گیا ہے ان سے کتنا فائدہ اور کتنا نقصان ہوا ہے۔

1972ء تک گولڈ سٹینڈرڈ کا عالمی نظام تھا جبکہ 1973ء میں امریکہ نے امریکہ میں گولڈ سٹینڈرڈ کا نظام ختم کردیا اب وہ جتنی چاہتا ہے پیپر کرنسی پرنٹ کرلیتا ہے کوئی پوچھنے والا نہیں جبکہ ترقی پذیر ممالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ اتنی ہی کرنسی پرنٹ کریں جتنا ان کے پاس گولڈ ہے۔ اس مسئلہ کو عالمی عدالت میں لیجانے کی ضرورت ہے۔

ترقی پذیر ممالک نے اگر ترقی کرنی ہے تو وہ طے کرلیں کہ وہ بارٹر سسٹم کی بنیاد پر بین الاقوامی تجارت کریں گے کرنسی کی ڈیلیوایشن نہیں کریں گے تو اس پر انہیں معلوم ہوگا کہ ایک ایف 16 طیارہ خریدنے کیلئے انہیں کتنی اشیاء و خدمات کو قربان کرنا پڑتا ہے بارٹر سسٹم کے خلاف ان ممالک نے اتنا پروپیگنڈہ کردیا ہے کہ اب اگر بارٹر سسٹم کا نام بھی لیں تو ان پڑھ

اور تعلیم یافتہ دونوں لوگ مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں کہ دنیا آگے کی جانب جارہی ہے اور آپ پیچھے کی جانب جارہے ہی ایک ماہر نفسیات کا مشہور معقولہ ہے کہ اگر 100 مرتبہ جھوٹ بولا جائے تو وہ سچ ہو جاتا ہے بارٹر سسٹم کے خلاف تو لاکھوں دفعہ جھوٹ بولا گیا ہے عام آدمی اس سچ کو کیسے اتنی جلدی تسلیم کرے گا ترقی یافتہ ممالک کی ترقی کا راز ان کا بہتر توازن ادائیگی ہے یعنی ان کی ایکسپورٹ کی قدر و قیمت زیادہ ہے یا دوسرے الفاظ میں وصولی زیادہ ہے جبکہ امپورٹ ایٹم پر کم از کم رقم انہیں ادا کرنا پڑتی ہے یہ سب سپر کرنسی کے نظام کی وجہ سے ہے۔ جس ملک نے بھی معاشی ترقی کی ہے اس کی کرنسی کی ویلیو میں سبھی آپ کو یقیناً اضافہ نظر آئے گا جیسے امریکہ، برطانیہ، فرانس، جاپان اور جرمنی وغیرہ وغیرہ بین الاقوامی تجارت ترقی پذیر ممالک کے وسائل لوٹنے کا ایک مہذب طریقہ ہے اس تجارت کی بدولت وہ اپنی زائد پیداوار یا فالتو اشیاء ہمیں فروخت کر دیتے ہیں اور ہمارے وسائل اپنی طرف منتقل کر لیتے ہیں بے شک بارٹر سسٹم ہی بین الاقوامی تجارت کے لئے بہترین نظام ہے اس کی وجہ سے ترقی پذیر ممالک کا توازن اادائیگی Balance of Payment بہتر ہوسکتا ہے بارٹر سسٹم کے تحت ہی ترقی پذیر ممالک سپر کرنسی ممالک سے تجارت کر کے فائدہ میں رہ سکتے ہیں۔ بارٹر سسٹم کے علاوہ اس کا ایک اور حل یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک آپس میں تجارت کرتے وقت سپر کرنسی کی بجائے اپنی اپنی کرنسی میں امپورٹ ایکسپورٹ کریں فرض کریں کہ پاکستان اور ملائشیا کے درمیان تجارت ہوتی ہے پاکستان ملائشیا سے الیکٹرانکس کی اشیاء درآمد کرتا ہے تو پاکستان کو چاہیے کہ وہ سپر کرنسی یعنی ڈالر، پاؤنڈ اور مارک کی بجائے اپنی کرنسی یعنی روپیہ میں ادائیگی کرے اس طرح اگر ملائشیا پاکستان سے کوئی شے امپورٹ کرتا ہے تو اسے اپنی کرنسی یعنی رنگٹ میں ادائیگی کرنی چاہیے اس طرح ترقی پذیر ممالک کی کرنسی مضبوط ہوگی اور آئی ایم ایف (International Monetary System) کے پاس کرنسی کی ڈی ویلیوایشن کا جواز جو وہ ترقی پذیر ممالک کی کرنسی کی ڈی ویلیوایشن کرتے وقت دیتے ہیں ختم ہو جائے گا مہاتیر محمد کے مطابق تجارت گولڈ کرنسی میں کی جائے اس سے بھی ترقی پذیر ممالک کا استحصال کم ہوگا۔ کیونکہ کرنسی کی ڈی ویلیوایشن نہیں ہوگی اور افراط زر

ختم ہو جائے گا کسی بھی ملک کی کرنسی سپر نہیں ہوگی سب ممالک کی کرنسی برابر ہو جائے گی اور کرنسی کی حد تک عالمی انصاف ممکن ہوگا گولڈ سٹینڈرڈ کے نظام کی وجہ سے جو ترقی پذیر ممالک کے اندر جو گولڈ جمع رہتا ہے۔ وہ بھی قابل استعمال ہو جائے گا۔ ایک اور تجویز یہ ہے کہ اقوام متحدہ کی زیر قیادت کرنسی چھاپنے کا ایک عالمی ادارہ قائم کرنا چاہیے اس عالمی کرنسی کو تمام ممالک تسلیم کریں اس طرح ون یونٹ کرنسی ویلیو برابر ہو جائے گی کرنسی کے ذریعے عالمی طاقتیں جو استحصال کرتی ہیں وہ نہیں ہوگا۔

غیر پیداواری سرمایہ کاری

ترقی پذیر ممالک اس لئے غریب نہیں ہیں کہ یہاں وسائل اور ذہانت کی کمی ہے بلکہ اس کی وجوہات کچھ اور ہیں مثلاً

(1) وسائل کی منتقلی ترقی پذیر ممالک سے ترقی یافتہ ممالک کو

(2) غیر پیداواری سرمایہ کاری

(3) ترقی پذیر ممالک کا آپس میں جنگ کرنا یا ایک ملک کا دوسرے ملک میں پراکسی وار (Proxy War) کروانا

(4) سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے نامکمل اصلاحات

(5) کرنسی کی ون یونٹ ویلیو کم ہونا

(6) سائنس ایجوکیشن کا غیر معیاری ہونا غیر پیداواری سرمایہ کاری سے مراد قومی دولت کا غلط استعمال ہے جس کی وجہ سے نہ تو قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی فی کس قومی آمدنی بڑھتی ہے جبکہ پیداواری سرمایہ کاری سے مراد ہے کہ:

(۱) نئی فیکٹری یا نیا پلانٹ لگنا

(۲) روزگار میں اضافہ

(۳) قومی آمدنی میں اضافہ

(۴) فی کس قومی آمدنی میں اضافہ

(۵) فنی ترقی

اگر مندرجہ بالا مقاصد سرمایہ کاری سے حاصل نہیں ہوتے تو اس کا مطلب ہے کہ غیر پیداواری سرمایہ کاری ہوئی ہے یہ غیر پیداواری سرمایہ کاری کیسے ہوتی ہے اور کیسے ترقی پذیر ممالک پر اثر انداز ہو رہی ہے اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

ایشیاء میں ترقی یافتہ ممالک سے سونا خریدا جاتا ہے جو کہ ترقی پذیر ممالک کی عورتیں عام طور پر زیورات کے طور پر استعمال کرتی ہیں جو کہ ایک غیر پیداواری عمل ہے اس سے ترقی پذیر ممالک کا سرمایہ ترقی یافتہ ممالک کو منتقل ہو جاتا ہے اس کے علاوہ یہ سونا گردش زر کو روک دیتا ہے جبکہ یہی سونا ترقی یافتہ ممالک میں عورتوں کی بجائے خلائی انڈسٹری (Space Industry) اور کمپیوٹر انڈسٹری میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ سونا کو خلا میں زنگ نہیں لگتا اسکے برعکس دوسری دھاتیں مثلاً سلور وغیرہ کو جلد زنگ لگ جاتا ہے۔

ترقی پذیر ممالک کو چاہیے کہ وہ اپنے ملک کی عورتوں کو ایجوکیٹ کریں اور بتائیں کہ

(۱) چوڑیاں اور کنگن ہتھکڑی کی علامت ہیں

(۲) پازیب بیڑی کی علامت ہے۔

(۳) بندی کوکھ کی علامت ہے۔

(۴) گلوبند پھانسی کی علامت ہے۔

(۵) نتھ جہالت غلامی اور بے شرمی کا نشان ہے۔

ان سب چیزوں کو ترقی یافتہ ممالک کی عورتیں نہیں پہنتی اگر ترقی پذیر ممالک کی عورتیں بھی یہی عمل کریں تو کھربوں روپیہ بچ سکتا ہے اور یہ سرمایہ پیداواری مقاصد کے لئے استعمال ہوسکتا ہے۔

ترقی پذیر ممالک کے اندر ایک اور غیر پیداواری عمل شروع ہوگیا ہے جس کا نام فارن کرنسی ایکسچینج سنٹر ہے۔ یہ کرنسی ایکسچینج سنٹرز ڈالرز اور پاؤنڈ کی روزانہ پرچیز اور سیل کرتے ہیں یہ پرچیز اور سیل کروڑوں ڈالر اور پاؤنڈ کی ہوتی ہے لوگ ڈالر اور پاؤنڈ خرید کر بنک میں جمع کرواتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ڈالر اور پاؤنڈ کی قیمت روزانہ بڑھ رہی ہے جبکہ روپے کی قیمت روزانہ کم ہو رہی ہے اس طرح ڈالر اور پاؤنڈ ترقی پذیر ممالک کیلئے امپورٹ ایٹم (Import Item) بن گئی ہے۔ پہلے ترقی پذیر ممالک کے لوگ روپے کو ڈالر کی صورت میں حاصل کرتے ہیں پھر یہ سرمایہ آسانی سے ڈالر اور پاؤنڈ کی صورت میں ترقی یافتہ ممالک میں منتقل کر دیتے ہیں علاوہ ازیں لوگوں نے نئی صنعت یا پیداواری سرمایہ کاری روک دی

ہے جو کہ پاکستان کیلئے بہت نقصان دہ عمل ہے اس سے اربوں روپے ضائع ہو رہے ہیں۔

ہر ترقی پذیر ملک کے قریب سمگلنگ سنٹر یا ٹیکس فری ملک ہے اس ملک کے ذریعے اربوں روپے کی سمگلنگ ہوتی ہے اس کی مثال یہ ہے فرض کریں کہ ایک ترقی یافتہ ملک نے ایک لاکھ ڈی وی ڈی (DVD) بنایا ہے ترقی پذیر ممالک کی مارکیٹ میں صرف 90 ہزار ڈی وی ڈی بکتا ہے باقی 10 ہزار بچ جاتا ہے اس 10 ہزار وی سی آر کو وہ ترقی یافتہ ممالک کے انٹرنیشنل الیکٹرانکس سمگلر کو بیچ دے گا جو یہ 10 ہزار ڈی وی ڈی ترقی پذیر ملک کو سمگل کر دے گا اس طرح ایک تو ترقی پذیر ملک کو ٹیکس نہیں ملے گا دوسرے نمبر پر ڈی وی ڈی اس ملک میں سستا ہونے کی بنیاد پر جلد بک جائے گا اس طرح سمگلنگ سے ترقی پذیر ملک ٹیکس سے بھی محروم ہو جائے گا اور غیر پیداواری عمل کا آغاز ہو جائے گا اس کی ایک اور مثال افغان ٹرانزٹ ٹریڈ ہے جس کی وجہ سے پاکستان کو اربوں روپے کا ٹیکس نہیں مل رہا ہے مثلاً پہلے افغانستان کے تاجر کراچی پورٹ کے ذریعے افغانستان کے لئے الیکٹرانکس کا سامان منگواتے ہیں جو کہ ٹیکس فری ہوتا ہے پھر یہی سامان دوبارہ پاکستان میں سمگل کر دیتے ہیں اس طرح پاکستان ٹیکس سے بھی محروم ہوتا ہے اور اندرون ملک صنعت کی بھی حوصلہ شکنی ہو جاتی ہے۔

امانتیں جمع کروانے اور وصول کروانے کیلئے بنک بنائے گئے ہیں بنک کا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ ان لوگوں، صنعتوں کو قرضہ دیں جو اس ملک کی ترقی میں کردار ادا کریں لیکن ترقی پذیر ممالک کے بنک زیادہ تر غیر پیداواری عمل کا حصہ بن گئے ہیں مثلاً ترقی پذیر ممالک کا غیر کاروباری آدمی بنک میں ڈالر اور پونڈ کی صورت میں رقم جمع کرواتا ہے اور اس کی وجہ Rupee Devaluation ہے یہی ڈالر اور پاؤنڈ کو ترقی یافتہ ممالک کی بڑی بڑی کمپنیاں بنک سے قرضہ کی صورت میں حاصل کر لیتی ہیں یہ کمپنیاں عام طور پر اجارہ درانہ پروڈکٹس بناتی ہیں جیسے کوکا کولا، پیپسی سگریٹ کمپنیاں وغیرہ وغیرہ رقم ترقی پذیر ممالک کی اور استعمال ترقی یافتہ ممالک کی کمپنیاں کرتی ہیں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غیر پیداواری عمل ترقی پذیر ممالک کے اندر شروع ہو جاتا ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں بلیک منی (Black Money) رکھنے والے کچھ بدنام سیاست دان بیوروکریٹس اور سمگلرز وغیرہ اپنا سرمایہ غیر ملکی بنکوں یعنی ترقی یافتہ ممالک میں جمع کرواتے ہیں کیونکہ ترقی یافتہ ممالک میں بلیک منی زیادہ محفوظ حالت میں رہتی ہے یہ ممالک ترقی پذیر ممالک کے بلیک منی ہولڈر کو تحفظ فراہم کرتے ہیں اس طریقہ سے ترقی پذیر ممالک کی آمدنی سے ترقی یافتہ ممالک فائدہ اٹھاتے ہیں اور قومی دولت ضائع ہو جاتی ہے۔

ترقی پذیر ممالک کے اکثر (Exporter) ایکسپورٹر ترقی یافتہ ممالک کے جاب ورکر اور ونڈر ہیں مثلاً فٹ بال بنانے کے لئے زیادہ تر مصنوعی لیدر امپورٹ ہوتا ہے یہی امپورٹڈ خام مال لگا کر یہ فٹ بال Addidas کمپنی یا کسی اور کمپنی کو دے دیا جاتا ہے کمپنی اپنا برانڈ لگا کر انٹرنیشنل مارکیٹ میں فروخت کر دیتی ہے مارکیٹ میں ترقی پذیر ممالک کا نام نہیں ہوتا بلکہ ترقی یافتہ ممالک کا نام ہوتا ہے اس طرح وہ ترقی پذیر ممالک کے گڈز مزدوری پر بنا کر خود ہی فروخت کر دیتے ہیں اور زیادہ منافع وہ حاصل کر لیتے ہیں ترقی پذیر ممالک میں (Basic Manufacturer) نہیں ہے اس سے مراد وہ صنعت کار ہے جو خام مال، مشینری اور فنشڈ گڈز تیار کرتا ہے یہاں فرنیچر انڈسٹری اور فوڈ پروڈکٹس (Food Products) میں بنیادی صنعتکار ہیں اسکے علاوہ کسی دوسری صنعت میں نہیں ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں بھی بنیادی صنعت کار پیدا کیا جائے۔ جیسے چائنہ اور جاپان میں ہے۔

کسی بھی ترقی یافتہ ممالک نے (Gas, Oil, Power, Telephone) یعنی Utlities کو کسی دوسرے ملک کے آگے فروخت نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس سے اندرون ملک گڈز مہنگی ہو جاتی ہیں اور ملک کی صنعت دوسرے ممالک کی صنعت سے مقابلہ نہیں کر سکتی اس لئے ترقی یافتہ ممالک نے اپنے ملک کے اندر ٹیلی فون، بجلی، گیس، آئل کے ریٹ بہت کم رکھے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں ان اشیاء کو فروخت کیا جا رہا ہے جو کہ ایک خطرناک عمل ہے۔ اس سے مستقبل میں ترقی پذیر ممالک کے اندر غیر پیداواری سرمایہ کاری کے امکانات بڑھ جائیں گے اور یوٹیلٹی بہت مہنگی ہو جائے گی جس سے نیشنل انڈسٹری کو

نقصان ہوگا۔

ترقی پذیر ممالک کے سیاست دان ملک کے اندر پیداواری سرمایہ کاری کرنے کی بجائے ترقی یافتہ ممالک کے اندر سیاسی سرمایہ کاری کرتے ہیں تا کہ ترقی پذیر ممالک میں حکومت حاصل کی جا سکے یہ سیاسی ایڈورٹائزنگ ایم این اے، سینٹرز، اخبارات اور میگزین میں رقم خرچ کر کے حاصل کرتے ہیں جسے وہ لابنگ کا نام دیتے ہیں یہ قومی دولت کا ضیاع ہے۔

زمین کا کاروبار ایک غیر پیداواری کاروبار ہے ہمارے ملک کے اندر زمین خریدنے کے پانچ سال بعد لازمی طور پر رقم دگنی ہو جاتی ہے یہ خرچ غیر پیداواری ہے اس سے ملک کے اندر افراط زر ہو جاتا ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں زمین کی خرید و فروخت کوئی کاروبار نہیں ہے وہاں حکومت ہی مختلف رہائشی سکیم بناتی ہے کیونکہ اس کاروبار سے صرف Transfer of Assets ہوتے ہیں فی کس قومی آمدنی ٹیکنالوجی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

ترقی پذیر ممالک کے اندر فنی تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے یہاں جنرل ایجوکیشن دی جاتی ہے جو کہ کم پیداواری عمل ہے اس سے معاشرے کے اندر چھپی ہوئی حقیقتوں کا تو علم ہوتا ہے۔ لیکن بذات خود تعلیم یافتہ شخص کوئی پیداواری کام نہیں کر سکتا ہے جبکہ اس کے برعکس ترقی یافتہ ممالک میں میٹرک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد قصاب، ٹیلرنگ، موٹر مکینک کا کام سیکھنے والے کو گرایجویٹ کی ڈگری مل جاتی ہے ترقی پذیر ممالک میں یہ کام شاگرد بن کر کیے جاتے ہیں اور یہ شاگردوں کا عمل زیادہ تر غیر اخلاقی ہوتا ہے ترقی پذیر ممالک کو چاہیے کہ وہ میٹرک کے بعد فنی تعلیم دے کر گرایجویٹ اور پوسٹ گریجوایٹ کی ڈگری دیں اس سے بے روزگاری کا بھی مسئلہ ختم ہو جائے گا اور ملک ترقی کرے گا۔

پاکستان میں انجینئرز اور ڈاکٹرز بنانے پر حکومت کا کافی سرمایہ خرچ ہوتا ہے اور اس خرچہ کو پیداواری سرمایہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ مستقبل میں یہی لوگ کسی ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں یہ ڈاکٹرز اور انجینئرز اپنی فیلڈ چھوڑ کر

(CSSP) سی ایس ایس پی آفیسر بن رہے ہیں جو کہ ایک غیر پیداواری عمل ہے اس عمل سے ملک کے اندر Brain Drain ہو رہا ہے حکومت کو چاہیے کہ وہ سی ایس ایس پی فیلڈ میں ڈاکٹرز اور انجینئرز کو جانے سے منع کریں یہ پھر کوٹہ مقرر کریں۔

سٹاک ایکسچینج کا بزنس پاکستان میں بہت زیادہ ہے ہر دس سال بعد اس میں بہت بڑا فراڈ ہوتا ہے لوگوں کی اربوں کی رقم ڈوب جاتی ہے سٹاک ایکسچینج کا بزنس ایک جعلی بزنس بن چکا ہے یہاں شیئر کی قیمت بھی جعلی بڑھتی ہے اور کم ہوتی ہے صرف چند ایک کمپنیوں کو چھوڑ کر باقی تمام کمپنیاں انویسٹر کو دھوکہ دے رہی ہے سٹاک ایکسچینج میں جو لوگ شیئر کی جعلی قیمت میں اضافہ کر دیتے ہیں انہیں روکنے کی ضرورت ہے اور لوگوں کو سمجھانے کی ضرورت ہے کہ وہ رقم کا صحیح استعمال کریں۔

اگر مندرجہ بالا خامیاں دور کر دی جائیں اور پیداواری سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی جائے تو قومی آمدنی، فی کس آمدنی اور روزگار میں اضافہ ممکن ہے۔

کتابیں، اخبارات اور جرائد جن سے استفادہ کیا

کتابیں	مصنفین
Issues in Pakistan Economy	S. Akbar Zaidi
The Dollar and the Rivals	Ricardo Parboni
The world fact book 1994-95	Brassey's
The Wealth of Nations	Adam Smith
Pakistan Drug Trap to Debt Trap	Dr. Akramul Haq
Capital	Karl Marx
Who Bankrupted Pakistan	Javaid Mehmood
Economic Survey Book 1994-95	Government of Pakistan
Economic Survey Book 2000-01	Government of Pakistan
Economic Survey Book 2005-06	Government of Pakistan
Evil Money	Rachel Ethrenfeld
Rogue State	William
توانائی کے سرچشمے	بہرام خان مجاہد
پاکستان کے ارب پتی خاندان	مقبول ارشد
ڈبلیوٹی او کیا ہے؟	بھگریت لال
سیاست اور معیشت	حامد سلطان
یورپ امیر کیسے بنا؟	لیو ہیوبرمین ترجمہ عبداللہ ملک

ہم غریب کیوں ہیں؟	عزیز الدین احمد
پاکستان کی معاشی ترقی کیسے ممکن ہے	غلام کبریا
پیداوار، سماج اور صنعت کاری	غلام کبریا
پاکستان میں منشیات کی سمگلنگ	موسیٰ خان جلال زئی
جاگیرداری اور سامراج	حمزہ علوی
پاکستان ریاست اور اُس کا بحران	حمزہ علوی
پاکستان غلامی کے پچاس سال	ڈاکٹر فیروز احمد
سامراج اور پاکستان	ڈاکٹر فیروز احمد / کاشف فراز احمد
مسلمان اور سائنس	پرویز امیر علی ہود بھائی
زندگی اور سائنس	اکبر علی ایم اے
پاکستان جدید دور کے تقاضے	اکبر علی ایم اے
کمپنی کی حکومت	باری علیک
پاکستان برطانوی غلامی سے امریکی غلامی تک	روش ندیم
حساس ادارے	بریگیڈیئر (ر) سید ارشاد احمد ترمذی
ایشیاء کا مقدمہ	مہاتیر محمد
سامراج کے مقابل	اقبال احمد
بدعنوانیاں	عابد تہامی

☆ روزنامہ نوائے وقت ☆ روزنامہ جنگ ☆ روزنامہ بزنس ریکارڈر

☆ منشور میگزین ☆ تکبیر میگزین ☆ ندائے ملت میگزین ☆ گلوبل سائنس میگزین

☆ جیو نیوز چینل ☆ اے آر وائی چینل ☆ بی بی سی نیوز چینل ☆ سی این این

حوالہ جات

نمبر شمار	مضمون	بحوالہ	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
1	مسلم ممالک کیوں ترقی یافتہ ممالک نہ بن سکے؟	روزنامہ ''نوائے وقت''	18-02-2005	11
2	انسانی وسائل، تیل، قدرتی گیس اور عالمی طاقتیں	روزنامہ ''نوائے وقت''	23-11-2003	19
3	منشیات اور عالمی طاقتیں	روزنامہ ''نوائے وقت''	17-08-2003	25
4	ملٹی نیشنل کمپنیاں، میڈیسن اور پاکستان	ماہنامہ ''دکھتی رگیں''	02-05-2003	31
5	پاکستان زراعت میں کیوں خود کفیل نہ ہوسکا؟	ماہنامہ ''منشور''	02-06-2002	37
6	انفارمیشن ٹیکنالوجی کا معاشی ترقی میں کردار	روزنامہ ''نوائے وقت''	01-07-2001	41
7	کرپشن کریسی	ماہنامہ ''ڈائری''	02-04-2001	45
8	این جی اوز سرمایہ کاری	ماہنامہ ''ڈائری''	01-11-2000	49
9	آبادی کا معاشی ترقی میں کردار	روزنامہ ''نوائے وقت''	31-10-2000	53
10	ٹیکس کا معیشت میں کردار	روزنامہ ''نوائے وقت''	22-08-2000	59
11	پاکستان میں انڈسٹریل کلچر کیوں پیدا نہ ہوسکا؟	روزنامہ ''نوائے وقت''	11-04-2000	63

12	سمگلنگ ایک معاشی ناسور	روزنامہ ''نوائے وقت''	02-11-1999	71
13	کاٹیج انڈسٹری کا معاشی ترقی میں کردار	روزنامہ ''نوائے وقت''	21-09-1999	75
14	بے روزگاری	روزنامہ ''نوائے وقت''	29-06-1999	79
15	وفاقی بجٹ 1999-2000ء (جائزہ)	روزنامہ ''نوائے وقت''	27-07-1999	83
16	معیشت اور ثقافت	روزنامہ ''نوائے وقت''	25-05-1999	89
17	افراطِ زر مہنگائی اور کرنسی ڈی ویلیوایشن	روزنامہ ''نوائے وقت''	03-04-1999	93
18	بینک اور بینک فراڈ	روزنامہ ''نوائے وقت''	27-02-1999	99
19	ترقی پذیر ممالک اور بین الاقوامی تجارتی خسارہ	روزنامہ ''نوائے وقت''	09-01-1999	105
20	ایڈز سے ایڈز تک	روزنامہ ''نوائے وقت''	15-10-1998	109
21	انسانی وسائل کی منتقلی	روزنامہ ''نوائے وقت''	13-09-1998	115
22	دولت کی غیر مساوی تقسیم	روزنامہ ''نوائے وقت''	09-07-1998	119
23	جدید دورِ غلامی	روزنامہ ''نوائے وقت''	31-05-1998	123
24	سائنس اور معیشت	روزنامہ ''نوائے وقت''	03-05-1998	127
25	کمپنیوں کی حکومت	روزنامہ ''نوائے وقت''	12-03-1998	133
26	سپر پاور کی سپر کرنسی	روزنامہ ''نوائے وقت''	12-02-1998	137
27	غیر پیداواری سرمایہ کاری	روزنامہ ''نوائے وقت''	29-01-1998	143

ISBN No. 969-28-0192-6

Rs:
120/-

ISBN No. 969-28-0163-2

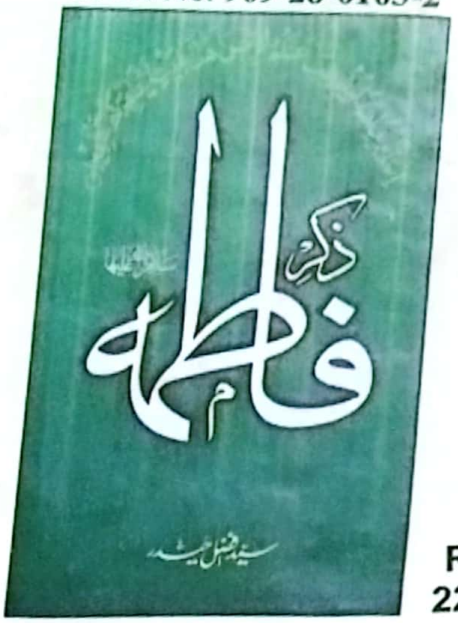

Rs:
225/-

ISBN No. 969-28-0154-3

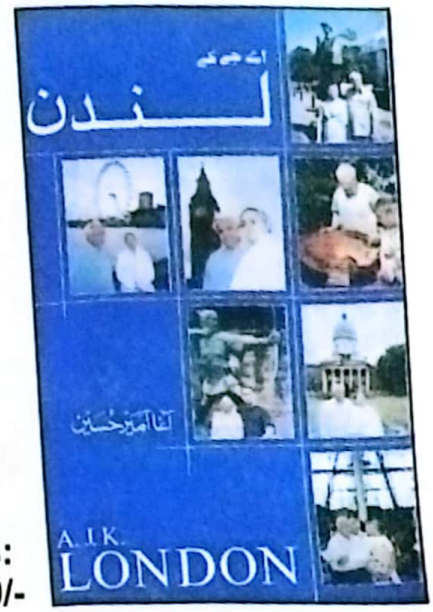

Rs:
200/-

ISBN No. 969-28-0001-6

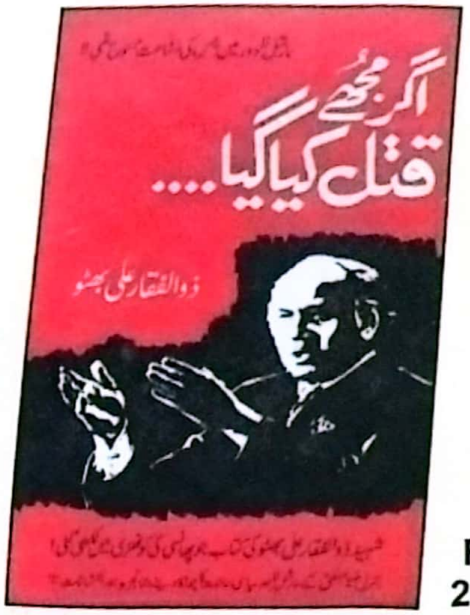

Rs:
200/-

ISBN No. 969-28-0107-1

Rs:
200/-

کلاسیک
42- دی مال، لاہور
فون: 7312977
فیکس: 7323963